یادِ شہید

علامہ قاضی عبدالنبی کوکب



فقیہِ اعظم پبلی کیشنز
دارالعلوم حنفیہ فریدیہ بصیرپور (اوکاڑا)

کتاب	یادِ شہید
تصنیف	علامہ قاضی عبد النبی کوکب
حروف سازی	نوری کمپوزنگ سنٹر، بصیر پور شریف
کمپیوٹر کوڈ	NOOR\KOKAB.INP
سنہ تصنیف	۱۹۵۹ء
اشاعت بارِ اوّل	اپریل ۲۰۰۰ء
اشاعت بار دوم	نومبر ۲۰۱۰ء
صفحات	160
مطبع	اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز، لاہور
ناشر	فقیہ اعظم پبلی کیشنز، بصیر پور شریف ضلع اوکاڑا

ISBN 969-9079-22-3



سٹاکسٹ

1. انجمن حزب الرحمٰن، بصیر پور شریف، ضلع اوکاڑا
2. ضیاء القرآن پبلی کیشنز، گنج بخش روڈ، لاہور
3. فرید بک سٹال، 38-اردو بازار، لاہور
4. شبیر برادرز، 40-اردو بازار، لاہور
5. مکتبہ غوثیہ، بابا جلال بلڈنگ، یونی ورسٹی روڈ، کراچی

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ کَمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی لَہٗ

اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ بِعَدَدِ کُلِّ مَعْلُوْمٍ لَّکَ

شرف انتساب

میں اپنی اس تالیف کا انتساب اپنے استاذ محترم الشیخ الفقیہ علامہ مفتی احمد یار خاں صاحب نعیمی مدظلہ العالی کے اسم گرامی سے کرتا ہوں، جن کے فیضِ تربیت سے میں اس قابل ہوا کہ کچھ پڑھ سکوں اور کچھ لکھ سکوں---

آناں کہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشہء چشمے بہ ما کنند

کوکب، گجرات

۱۹۵۹ء

مندرجات

تقدیم

نواسۂ رسول، جگر گوشۂ بتول، حیدر کرار کے عظیم فرزند، ملت اسلامیہ کے بطل جلیل، شہزادۂ گلگوں قبا، سید الشہداء، امام عالی مقام، سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ نے اعلائے کلمۃ الحق اور شریعت محمدیہ کی بالا دستی کے لیے معرکۂ کربلا میں جو لازوال شہادت اور عظیم الشان قربانی پیش کی اور اپنے اور اپنے عزیز و اقارب کے خون سے جو ان مٹ نقوش ثبت کیے ہیں، تاریخ حریت اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے---

معرکۂ کربلا حق و باطل کے درمیان فیصلہ کن ٹکر تھی--- باطل اپنے تمام تر لاؤ لشکر کے ساتھ حق کے مقابل آیا، یزیدی فوجوں نے اپنی تلواروں کا رخ

قافلۂ حسین کی جانب موڑ دیا اور وہ جملہ اسباب جن کا تعلق جبر و استبداد، تیر و تفنگ، نیزہ و سناں، حرص و ہوا اور دولت و ثروت سے تھا، وہ سارے کے سارے نظریۂ حسین کے مخالف تھے اور وہ سب کچھ جس کا انحصار تقویٰ و طہارت، صبر و استقامت اور حق و دیانت سے تھا، وہ حسینی قافلہ کے پلڑے میں تھا--- بظاہر میدان کربلا میں شمشیر و سناں کی فتح تھی، بدی کا غلبہ تھا اور حرص و ہوا کی کامیابی تھی--- شہیدوں کی بکھری ہوئی لاشیں، اہل بیت کے خیموں میں سے لپکتے ہوئے آگ کے شعلے، تپتا ہوا صحرا، امام ہمام کی لاش کو گھوڑوں کا روندنا اور یزیدی لشکر کا طبل فتح بجانا--- اس کے باوجود فاتح کون اور مفتوح کون تھا؟ اس کا فیصلہ تاریخ نے چھپا نہیں رکھا--- دنیا نے دیکھ لیا کہ یزید حرف غلط کی طرح مٹ گیا، خائب و خاسر ہو کر مرا اور حق سر بلند ہوا--- برس ہا برس بیت جانے کے باوجود حسین کی جرأت و استقامت، وفا شعاری و راست بازی، دین حق اور اعلائے کلمۃ الحق کے لیے حقیقی طور پر سر دھڑ کی بازی لگا دینے کے تذکرے ہوتے رہے ہیں--- ہوتے رہیں گے--- جب تک فلک نیلگوں پر ستارے جھلملاتے رہیں گے--- جب تک سورج اپنی نقرئی کرنوں سے عالم پر ضو پاشی کرتا رہے گا--- جب تک مؤذن کی اذان کی گونج سنائی دیتی رہے گی اور جب تک خدا اور رسول خدا (جل جلالہٗ و صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کا نام لیوا، ایک فرد بھی باقی رہے گا، ذکر حسین ہوتا رہے گا--- نام حسین کا ورد لبوں پر جاری رہے گا--- شہادت حسین کا تذکرہ اہل ایمان کو ایک نیا عزم اور ولولۂ تازہ بخشتا رہے گا--- اس لیے کہ وہ زندہ ہے، ان کا نام زندہ ہے، ان کا کردار زندہ ہے اور زندہ رہے گا---

اس محسن ملت اور شہید اعظم کی فقید المثال شہادت سے درس حاصل کرنے کی بجائے آپ کے تذکار شہادت کے بیان میں بے جا افراط و تفریط سے کام لیا گیا---

ایک طبقہ نے اسے داستانِ غم کے طور پر لیا اور مقاصد شہادت کو سیاہ ماتمی پردوں میں چھپا دیا--- جب کہ دوسرے طبقہ نے تحقیق کے نام پر آپ کی تابناک شخصیت اور سنہری کارناموں کو کم سے کم تر دکھانے کی ناروا کوشش کی اور اس میں اس حد تک تعصب بلکہ بغض و کینہ سے کام لیا، گویا یزید کے وکیل صفائی اپنا مقدمہ پیش کر رہے ہوں---

اس پس منظر میں ضرورت اس امر کی تھی کہ افراط و تفریط سے دامن بچا کر مستند اور ٹھوس مآخذ سے اصل حقائق پیش کیے جائیں--- زیرِ نظر کتاب ''یادِ شہید'' اسی سلسلہ کی حسین اور خوب صورت کڑی ہے--- فاضل مصنف قاضی عبد النبی کوکب رحمۃ اللہ علیہ مایہ ناز ادیب، روشن فکر خطیب، عالی دماغ مفکر اور نکتہ رس عالم و محقق تھے--- جو درسیات میں نعیمی مکتب فکر کے ممتاز شیخ، حکیم الامت مفتی احمد یار خاں نعیمی قدس سرہ العزیز کے تلمیذ رشید تھے، جب کہ دوسری طرف جدید علوم پر بھی مکمل دسترس رکھتے تھے---

کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے--- پہلے حصہ میں امام عالی مقام رضی اللہ عنہ کے حالات طیبہ اور سیرت، دوسرے حصہ میں تاریخ کربلا (جس میں مدینۃ النبی سے ریگ زار کربلا اور معرکۂ کربلا کے واقعات--- منظر اور پس منظر) کا بیان ہے اور تیسرے حصہ میں ان اعتراضات کے جوابات دیے گئے ہیں، جو اس سانحہ کے حوالے سے بعض حلقوں کی جانب سے اٹھائے جاتے ہیں---

محترم قاضی عبد النبی کوکب کا اندازِ تحریر نہایت عمدہ، محققانہ اور علمی ہے---

''یادِ شہید'' پہلے پہل ۱۹۵۹ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہوئی، عرصہ سے نایاب تھی--- قاضی کوکب صاحب کے رفیق خاص علامہ احمد علی قصوری صدر مرکز اہل سنت پاکستان نے ازراہ کرم یہ گراں قدر کتاب عنایت فرمائی، جسے اب جدید انداز میں نتیجہ اعظم پبلی کیشنز بصیر پور شریف (اوکاڑا) کی طرف سے شائع کیا جا رہا ہے--- (زیرِ نظر نئے ایڈیشن میں

''سانحہ کربلا علامہ اقبال کی نظر میں'' کے عنوان سے علامہ قاضی عبدالنبی کوکبؔ صاحب کا ایک فکر انگیز مضمون شامل کیا جارہا ہے) امید کہ اہل بصیرت اور اہل محبت اسے قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے---

آج کے پُر آشوب دور میں بطور خاص اس امر کی ضرورت ہے کہ واقعہ کربلا کا مطالعہ کیا جائے اور اس کی روح کو سمجھا جائے--- کیوں کہ شہادت حسین اہل ایمان کو نئے ولولہ سے سرشار کرتی ہے--- تاریخ اسلام کی یہی وہ لازوال داستان ہے جو ''سادہ ورنگین'' ہونے کے باوصف رہتی دنیا تک حریت فکر اور حق کی سربلندی رکھنے والے افراد کو باطل قوتوں کے خلاف نبرد آزما ہونے کا حوصلہ اور شوق فراواں عطا کرتی رہے گی---

کاش امت مسلمہ اس ''داستانِ حرم'' سے درس حاصل کرتی اور اس کی روح کو سمجھتے ہوئے، باطل اور طاغوتی طاقتوں سے نبرد آزما ہوتی رہے--- مگر مسلمان باہم دست بہ گریبان ہیں--- عالم اسلام بالعموم اور پاکستان بالخصوص اس وقت جن نازک اور سنگین حالات سے گزر رہا ہے، وہ کسی بھی صاحب بصیرت سے مخفی نہیں ہیں---

امت مسلمہ، یہود وہنود اور نصاریٰ کی جن سازشوں کا شکار ہے اور سی ٹی بی ٹی اور نیو ورلڈ آرڈر کی صورت میں اسے جس ''نارِ نمرود'' اور ''معرکۂ کربلا'' کا سامنا ہے، اس کا حل صرف اور صرف اسوۂ خلیل (علیہ السلام) اور جذبہ شبیر کو زندہ رکھنے اور دل وجان سے اس پر عمل پیرا ہونے میں مضمر ہے---

ریگ زار کربلا آج بھی ذلت ونکبت کی شکار، خوابیدہ امت مسلمہ کو زبان حال سے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بیدار کررہا ہے---

قافلۂ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں
گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ وفرات

ادارہ ''فقیہ اعظم پبلی کیشنز'' بہزار خلوص و نیاز یہ گلدستہ عقیدت و محبت پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے---

اللہ تعالیٰ جل وعلا امت مسلمہ کو اسوۂ حسین پر گامزن ہونے کی توفیق ارزانی فرمائے---

آمین بجاہ سید الکونین جد الحسن و الحسین

صلی اللہ علیہ و آلہ و اصحابہ اجمعین

من لدنا یومنا ھذا الی یوم الدین

بصیر پور شریف
۲۱رذوالحجۃ المبارکہ ۱۴۲۰ھ
۲۸رمارچ ۲۰۰۰ء

(صاحبزادہ) محمد محب اللہ نوری
مدیر اعلیٰ ماہ نامہ نورالحبیب
مہتمم دارالعلوم حنفیہ فریدیہ

استقامت کا نیا درس زمانے کو ملا
جب سرِ کرب و بلا ان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نواسہ رضی اللہ عنہ اترا

[راجا رشید محمود]

یادِ شہید

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسین، ابتدا ہے اسماعیل

[علامہ اقبال]

میرا مقصد

الحمد للّٰہ ولی الفضل و الانعام

و السلام علٰی حبیبہ خیر الانام

و علٰی آلہ الکرام و صحبہ العظام

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

اس تالیف سے میرا مقصد یہ ہے کہ سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کے متعلق تین چیزیں ایک ہی کتاب میں جمع کر دی جائیں:

1. آپ کے حالاتِ زندگی اور سیرت
2. کربلا کی تاریخ اور
3. مختلف مکاتبِ فکر کے خدشات و اعتراضات سے بحث اور ان کا ازالہ

سیرت کے بیان میں یہ امر ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے کہ امام موصوف کی زندگی کے ابتدائی ایام پر متعدد پہلوؤں سے روشنی ڈالی جائے تا کہ ان اسباب وموجبات تک ہر شخص کی نظر پہنچے جو سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کی ذات میں صحیح اسلامی سیرت اور ایک مضبوط کریکٹر کی تخلیق کر رہے تھے۔ کربلا کے واقعات میں ایک طرف صحیح اور مستند معلومات درج کرنے کے لیے اصل ماخذ (مثلاً کامل ابن اثیر، تہذیب التہذیب، الاستیعاب اور صحاح احادیث وغیرہ) کو دیکھا گیا ہے اور دوسری طرف واقعاتی ترتیب میں ایک سلیقہ اور نکھار سا پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے تا کہ پڑھنے والا نہ الجھے اور نہ اکتائے---

اعتراضات کی بحث میں ان غلط فہمیوں کو دور کرنا مقصود ہے، جو واقعات کی صحیح تصویر کو گدلا کرنے اور نیز امام عالی مقام رضی اللہ عنہ کے مشن ہی کو نگہ سے اوجھل کر دینے کا باعث بنتی ہیں---

میری دعا ہے کہ رب عالم جل جلالہ اس کوشش کو قبول فرمائے---آمین

توکلت علی اللہ

و علیہ فلیتوکل المتوکلون

عبدالنبی کوکب

سیرت طیبہ

در نوائے زندگی سوز از حسین
اہلِ حق حریت آموز از حسین

[علامہ اقبال]

ابتدائی حالات

ولادت

سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ ۵ر شعبان المعظم ۴ھ، مطابق ۵ر جون ۶۲۶ء کو مدینۃ النبی میں پیدا ہوئے۔ جب آپ کی ولادت کی خوش خبری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تک پہنچی، تو آپ فوراً زہراء جنت رضی اللہ عنہا کے ہاں تشریف لائے اور فرمایا:

"میرا پارۂ جگر، میری گود میں دو"---

ننھے حسین (رضی اللہ عنہ) ایک پاکیزہ کپڑے میں لپیٹ کر حضور ﷺ کی آغوش میں رکھ دیے گئے۔ آپ ﷺ نے پیارے بچے کے کانوں میں اذان اور اقامت کہی---

شروع میں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شیر خوارگی، حضرت ام الفضل کے سپرد کی گئی، کیوں کہ سیدہ زہراء رضی اللہ عنہا کی گود میں ابھی حضرت حسن رضی اللہ عنہ دودھ پیتے تھے۔ ام الفضل، حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی اہلیہ، یعنی رسول خدا ﷺ کی چچی تھیں۔ چند روز پیش تر یہی ام الفضل رضی اللہ عنہا حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کر رہی تھیں:

''حضور! میں نے ایک ڈراؤنا خواب دیکھا ہے کہ آپ کے جسم کا ایک ٹکڑا کاٹ کر میری گود میں ڈال دیا گیا ہے''---

حضور ﷺ نے فرمایا تھا:

''چچی! یہ تو بڑا اچھا خواب ہے''---

چناں چہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی پیدائش کے بعد حضور ﷺ نے انہیں ام الفضل رضی اللہ عنہا کی گود میں دے دیا اور اس طرح ان کا مبارک خواب پورا ہوا---

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے عقیقے میں خود حضور ﷺ نے دو جانور ذبح کیے اور سر کے بال منڈوا کر ہم وزن چاندی خیرات کر دی---

حضرات حسن و حسین رضی اللہ عنہما کس قدر خوش نصیب تھے کہ انہیں فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا جیسی ماں نصیب تھی۔ آپ رضی اللہ عنہا ایک طرف چکی پیستیں، کنویں سے مشکیزے بھرتیں اور دوسری طرف شہزادوں کا جھولا بھی جھولاتی رہتیں---

اس گھر میں تربیت و تادیب کے طریقے بھی ساری دنیا سے نرالے تھے۔ ایک دن دونوں بھائی بچپن کے بھولے پن سے آپس میں لڑے اور پھر والدہ کے پاس شکایت لائے کہ مجھے بھائی نے مارا ہے، اس پر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

78178

"مجھے اس بات سے کچھ غرض نہیں کہ حسین رضی اللہ عنہ نے مارا، یا حسن رضی اللہ عنہ نے، میں تو یہ جانتی ہوں کہ تم دونوں پر خداوند تعالیٰ ناراض ہو گیا ہے، کیوں کہ وہ لڑائی جھگڑے کو پسند نہیں کرتا"---

یہ سن کر ننھے حسنین ملول ہوئے اور کہنے لگے:

"امی! اب معاف کر دیجیے، آئندہ ہم کبھی نہ لڑیں گے"---

آپ بولیں:

"معافی اپنے خدا سے مانگو، چلو وضو کرو اور مصلے پر کھڑے ہو جاؤ"---

چناں چہ پاک بچے، خدا کے دربار میں کھڑے ہو گئے---[۱]

آغوشِ رسالت

حسن و حسین رضی اللہ عنہما کی عظمتوں کا راز یہ تھا کہ انہیں آغوش رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دولت عظمیٰ نصیب تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان سے انتہائی محبت رکھتے تھے، ہر روز انہیں دیکھنے کے لیے بیٹی کے گھر جاتے، انہیں اٹھا لیتے، ساتھ چمٹاتے، کھلاتے، پیار کرتے، چومتے اور کبھی یوں سونگھتے تھے، جیسے کہ پھولوں کو سونگھا جائے اور فرمایا کرتے:

هُمَا رَيْحَانَتَايَ مِنَ الدُّنْيَا---[ترمذی]

"یہ دنیا میں میرے پھول ہیں"---

بخاری و مسلم اور دوسری صحاح کی وہ حدیثیں کسے معلوم نہیں کہ ان بچوں کے لیے

[۱]...... یہ واقعہ، سیمابؔ اکبر آبادی نے منظوم کیا ہے، میں نے ان کی نظم سے ہی لیا ہے---

حضور ﷺ خطبے کے منبر سے اتر آتے اور ان کے لیے سجدہ کو لمبا فرما دیتے، حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ گواہ ہیں، آپ ﷺ فرمایا کرتے:

"یہ دونوں میرے بچے اور میری بیٹی کے لڑکے ہیں، اے اللہ! میں ان دونوں کے ساتھ محبت کرتا ہوں تو بھی ان دونوں سے اور ان کے ساتھ محبت رکھنے والوں سے محبت فرما"---[ترمذی]

احادیث کو بغور دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے محبت نسبتاً زیادہ تھی---

ایک مرتبہ آپ ﷺ، سیدہ رضی اللہ عنہا کے گھر کے پاس سے گزر رہے تھے کہ کان میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے رونے کی آواز پڑی، حضور ﷺ بے قرار ہو کر رک گئے اور بیٹی کو آواز دی:

"فاطمہ! کیا تم نہیں جانتی کہ اس کے رونے سے مجھے تکلیف ہوتی ہے"---

ایک دن سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ دربار رسالت میں حاضر ہوئے، دیکھا کہ حضور ﷺ کے کندھے پر حضرت حسین رضی اللہ عنہ سوار ہیں، سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ بولے:

نِعْمَ الْمَرْکَبُ---

"کیا اچھی سواری ہے"---

حضور ﷺ نے فرمایا:

وَنِعْمَ الرَّاکِبُ---

"اور سوار بھی تو بہت اچھا ہے"---

حضرت ام الفضل نے ایک موقع پر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو ذرا سختی اور عجلت

سے گود میں لیا۔ حضور ﷺ سے نہ رہا گیا، فوراً فرمایا:

مَهْلًا يَا أُمَّ الْفَضْلِ مَهْلًا---

"اے ام فضل! بچے کو چھوڑ دو"---

اصابہ اور الاستیعاب میں آیا ہے:

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ اَبْصَرَتْ عَيْنَايَ هَاتَانِ وَ سَمِعَتْ اُذُنَايَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ وَ هُوَ اٰخِذٌ بِكَفَّيْ حُسَيْنٍ وَ قَدَمَاهُ عَلٰى قَدَمِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَ هُوَ يَقُوْلُ تَرَقَّ تَرَقَّ عَيْن بقه قَالَ فَرَقِيَ الْغُلَامُ حَتّٰى وَضَعَ قَدَمَيْهِ عَلٰى صَدْرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ ثُمَّ قَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِفْتَحْ فَاكَ ثُمَّ تَفَلَ ثُمَّ قَبَّلَهٗ ثُمَّ قَالَ اَللّٰهُمَّ اَحِبَّهٗ فَاِنِّيْ اُحِبُّهٗ---

[اصابہ ابن حجر عسقلانی، الاستیعاب، جلد ا، صفحہ ۵-۱۴۴]

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، میری ان آنکھوں نے دیکھا اور کانوں نے سنا کہ حضور سرورِ عالم ﷺ، حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں کو پکڑے ہوئے تھے اور حسین رضی اللہ عنہ کے پاؤں، حضور ﷺ کے پاؤں پر رکھے تھے اور رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے:

اے ننھے قدموں والے! چڑھ آ چڑھ آ، چناں چہ بچہ جسم اطہر پر چڑھنے لگا، یہاں تک کہ اپنے قدم حضور ﷺ کے سینے پر رکھ دیے۔ پس آپ نے فرمایا:

منہ کھول--- پھر آپ نے لعاب دہن ڈالا اور منہ چوم لیا، پھر فرمایا:

اے اللہ! اسے محبوب رکھ کہ میں اسے محبوب رکھتا ہوں"---

نرالی تربیت

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو کسی مدرسے یا تربیت گاہ میں جانے کی کیا حاجت تھی جب کہ خود ان کے نانا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معلم کائنات تھے۔ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، پیارے نواسوں کو اکثر ساتھ رکھتے، گھر میں نماز پڑھتے وقت انہیں قریب کر لیتے، بعض اوقات دعوت پر ساتھ لے جاتے، اس طرح بچوں کی ہر ادا کا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مطالعہ فرماتے اور جب ضرورت ہوتی تو ہدایت بھی فرماتے تھے---

ایک مرتبہ آپ کے پاس، زکوٰۃ کی کھجوروں کا ٹوکرا رکھا تھا کہ امام حسین رضی اللہ عنہ آ گئے، آپ بچے تھے، ایک کھجور اٹھا کر منہ میں رکھ لی، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فوراً انگلی ڈال کر کھجور نکال دی اور فرمایا:

کخ کخ---[صحیح بخاری، جلد ۲، صفحہ ۱۲۹]

''پیغمبر کے گھر والے زکوٰۃ نہیں کھاتے''---

بعض روایات بتلاتی ہیں کہ ان بچوں کو نماز کا پورا طریقہ بھی خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہی سکھایا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے کھیل کو بھی دلچسپی سے دیکھتے اور حوصلہ افزائی فرماتے تھے تاکہ جسمانی قویٰ بھی صحیح نشو ونما پائیں---

علامہ ابن حجر عسقلانی نے روایت کی ہے:

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ کَانَ الْحَسَنُ وَ الْحُسَیْنُ یَصْطَرِعَانِ بَیْنَ یَدَیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم---[اصابہ، ابن حجر]

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، حسن و حسین رضی اللہ عنہما، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے سامنے کشتی لڑا کرتے تھے"---

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ قریش کے لکھنے پڑھنے والے لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ وہ، اپنے شہزادوں کو بھی لکھنا پڑھنا سکھاتے تھے، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حسن و حسین رضی اللہ عنہما آپس میں خوش خطی کا مقابلہ کرتے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دکھاتے، مگر آپ کسی ایک کے حق میں فیصلہ نہ دیا کرتے تھے تاکہ کسی کی دل شکنی نہ ہو---

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے بچپن کے سات سال سات ماہ سات دن رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سایہ شفقت میں گزارے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتقال کے بعد تربیت کی ذمہ داری سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے سنبھالی۔ آپ نے جہاں شہزادوں کو حکمت کے درس دیے، وہاں شمشیر زنی، شہ سواری اور فنون جہاد میں بھی ماہر کر دیا---

عہد خلافت میں

خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم، دل کی گہرائیوں سے چاہتے تھے کہ ان کا ہر کام رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایت کے مطابق ہو، چناں چہ ان کی کوشش اور خواہش تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر والوں کو کوئی تکلیف نہ پہنچے---

جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا کہ میں اہل بیت پر اسی طریقے سے خرچ کیا کروں گا، جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خرچ فرماتے تھے---

خلیفہ دوم فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ رقمیں تقسیم فرماتے ہوئے حسن و حسین رضی اللہ عنہما کو دس دس ہزار درہم دیے۔ اس پر خلیفۃ المسلمین کے صاحبزادے، عبداللہ بولے: ان حضرات کو رقم زیادہ ملی ہے، حالاں کہ میری اسلامی خدمات زیادہ ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نہایت برہم ہوئے اور فرمایا:

عبداللہ! تمہاری بات سے مجھے رنج ہوا، کیا تمہارا نانا، ان کے نانا کے مانند ہے؟---
کیا تمہاری ماں، ان کی ماں کے مانند ہے؟---کیا تمہاری نانی، ان کی نانی کے مانند ہے؟..........---

سنو! ان کے نانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، ان کی والدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا ہیں اور ان کی نانی حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا ہیں---

جب یمن کے بنے ہوئے حلّے مدینہ میں پہنچے اور سب لوگوں میں تقسیم ہو گئے۔ لوگ حلے پہن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو سلام کرنے مسجد کی طرف آ رہے تھے کہ حضرات حسن و حسین رضی اللہ عنہما بھی تشریف لائے، مگر ان کے جسم پر کوئی حلّہ (قیمتی جبہ) نہ تھا۔ آپ نے بے قرار ہو کر فرمایا:

لوگو! تمہارے حلّے پہننے سے مجھ کو خوشی نہیں ہوئی کیوں کہ ان شہزادوں کے طفیل تمہیں حلّے ملے ہیں لیکن ان کے جسم حلّوں سے خالی ہیں---

اسی وقت حاکم یمن کو لکھا کہ دو قیمتی حلّے بھیج دو اور جب حسنین کریمین رضی اللہ عنہما وہ حلّے پہن کر نکلے تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرط مسرت سے فرمایا:

"اب مجھے سچی خوشی حاصل ہوئی ہے"---

ایک دن حضرت حسین رضی اللہ عنہ منبر نبوی کی طرف بے باکانہ بڑھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے خطبہ کے دوران میں کہا:

"اے عمر! میرے نانا کے منبر سے اترو اور اپنے باپ کے منبر پر جاؤ"---

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا:

"میرے باپ کا کوئی منبر نہیں اور یہ سب جو کچھ ہمیں ملا ہے، تمہارا اور

تمہارے نانا کا صدقہ ہے"---

پھر آپ شہزادے کو گھر لے گئے اور تاکید فرمائی کہ کبھی کبھی تشریف لایا کرو---

[تہذیب التہذیب]

عہد عثمانی تک حسن و حسین رضی اللہ عنہما جوان ہو چکے تھے، چناں چہ اس زمانے میں آپ نے اسلامی فتوحات میں حصہ لیا--- سیدنا حسین رضی اللہ عنہ جہاد طبرستان اور افریقہ کی مہمات میں شریک ہوئے، تفصیل آگے آرہی ہے---

سیرت

بچپن میں تربیت و تادیب کا جو پاکیزہ ماحول، سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کو میسر آیا تھا، اس نے آپ کی زندگی کو علم و فضل، شجاعت و بسالت، ہمت و عزیمت، تقویٰ و طہارت اور زہد و ورع کی صحیح اسلامی تصویر بنا دیا تھا---

ذوق عبادت

آپ نے آنکھیں کھولیں تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، سیدنا علی المرتضیٰ اور سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہما

کی نمازیں، تلاوتیں اور سجدے دیکھے---اس لیے یہ ذوق، زندگی کا ایک مستقل حصہ بن گیا:

لگا دی ہے مرے محبوب نے ایسی لگن مجھ کو
گزاروں گا اسی لذت میں باقی کی عمر اپنی

کبھی آپ پر ایسی حالت بھی آ جاتی تھی کہ پورا پورا دن اور ساری ساری رات نماز میں گزار دیتے۔ ایسے موقعوں پر آپ دن رات میں ہزار ہزار رکعت پڑھ جاتے---

[زین العابدین]

رات کی نماز میں جب تلاوت شروع کرتے تو آنکھیں آنسو برسانے لگتیں، گلے میں آواز اٹکتی اور رک رک جاتی۔ جب قیام میں ہوتے تو تلاوت کی محویت میں گھنٹوں کھڑے رہتے اور جب سجدے میں سر رکھتے تو لذت نیاز سے اٹھانے کو جی نہ چاہتا اور اسی طرح راتیں تمام ہو جاتیں---

اَلَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِیَامًا---[الفرقان:۶۴]

"جو کہ اپنے رب کے لیے سجدے کرتے ہیں اور قیام کرتے ہوئے، راتیں گزار دیتے ہیں"---

ذکر و عبادت کا یہ ذوق، مدینہ سے لے کر کوفہ تک کے اس سفر میں بھی نہ بھولا، جو سفر کربلا کہلاتا ہے اور جو آپ کی عمر میں آخری سفر تھا---

۲۷؍رجب المرجب ۶۰ھ کی رات کو جب آپ مدینہ طیبہ سے روانہ ہونے لگے تو پہلے نانا جان ﷺ کے گنبد خضریٰ پر حاضر ہوئے۔ وہاں رات کا ایک حصہ ذکر و دعا اور نانا جان ﷺ کے حضور میں عرض و مناجات کرتے گزارا۔ پھر فرات کے کنارے پہنچ کر ۹؍محرم الحرام ۶۱ھ کو جب دیکھا کہ دشمن جنگ شروع کرنا چاہتا ہے تو آپ نے

گھر کا ایک آدمی بھیج کر کوفیوں سے ایک رات کی اجازت لے لی، بس پھر یہ رات نمازوں، دعاؤں، استغفار و انابت اور عجز و تضرع کی رات تھی۔ ایک راوی کہتا ہے کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ یہ آیت پڑھ رہے تھے:

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ---[آل عمران:۱۷۹]

”خدا اہلِ ایمان کو اسی حالت میں نہ چھوڑ دے گا، وہ پاک کو ناپاک سے الگ کر دے گا“---

جعفر بن سلیمان کا بیان ہے کہ میں نے نو اور دس محرم کی درمیانی رات خیمے سے روشنی پھوٹتی دیکھی اور جھانک کر دیکھا تو حضرت امام رضی اللہ عنہ کے سامنے قرآن حکیم کھلا ہوا ہے اور آپ تلاوت فرما رہے ہیں اور آنکھوں سے آنسو جاری ہیں---

[تہذیب التہذیب]

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ یہ عمر کی آخری رات ہے، اس لیے انہوں نے چاہا کہ آج جی بھر کر اپنے خدا کی یاد کر لوں اور دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے، اسی کے ذکر کا زادِ راہ لیتا جاؤں۔ زندگی کا یہ گوشہ وہ ہے، جہاں بندۂ مومن خدائے برحق کے حضور میں جھکا ہوا، اس کے سامنے اپنی طاعت و عبدیت کا اقرار کرتا ہوا نظر آتا ہے اور اس کا مظہر آپ نے اوپر کی سطروں میں دیکھا---

مجاہدانہ بسالت

اب یہ ورق الٹ کر ان میدانوں کا نقشہ دیکھیے، جہاں باطل کی طاقتیں، حق سے

ٹکرانے کو امڈ رہی ہوتی ہیں۔ یہاں حق کے پرچم کو سچائی کے وہ پروانے مطلوب ہوتے ہیں، جن کے جوشِ صداقت سے، طاغوت کا زہرہ آب ہوتا ہے اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ، وہی رات کی خاموشی میں اللہ کی یاد میں محو رہنے والے حسین رضی اللہ عنہ، یہاں بھی شمشیر بدست میدانوں کی چھاتی پہ ٹہلتے ہوئے نظر آتے ہیں اور یہی سچے مومن کی زندگی ہے کہ وہ رات کا نمازی ہوتا ہے اور دن کا غازی ہوتا ہے---

۳۰ھ/ مطابق ۶۵۰ء کو عہدِ عثمان رضی اللہ عنہ میں طبرستان کی طرف جو فوجی مہم روانہ کی گئی تھی، حضرت حسین اور ان کے بھائی حضرت حسن رضی اللہ عنہما دونوں اس میں شریک ہوئے---

[تاریخ الامم والملوك، طبری]

اسی طرح آپ ان مجاہدین میں بھی شامل تھے، جنہوں نے پہلے مصر فتح کیا اور بعد میں افریقہ کے میدانوں میں اتر کر اسلام کا پھریرا لہرایا۔ امام حسین رضی اللہ عنہ اپنے بھائی سمیت اسی لشکر میں کام کرتے ہوئے مغربِ اقصیٰ تک پہنچے تھے---

جب بلوائیوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا محاصرہ کر رکھا تھا، اس وقت آپ دونوں بھائی، ننگی تلواریں لیے ہوئے، خلیفۃ المؤمنین کے دروازے پر کھڑے تھے۔ چناں چہ فسادیوں کی فوج دروازے کی طرف سے آخر دم تک مکان میں داخل نہ ہو سکی مگر خلیفہ کی شہادت مقدر ہو چکی تھی، بلوائی پچھلی طرف سے دیوار پھاند کر اندر گھس گئے اور سیدنا عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ شہید کر دیے گئے۔ خلیفہ کی شہادت کی خبر سنتے ہی حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم غم و غصہ سے بھرے ہوئے تشریف لائے اور صاحبزادوں کو تھپڑ مارتے ہوئے کہا:

"تمہارے ہوتے ہوئے یہ کیسے ہو گیا؟"---

دونوں بھائی گو بے قصور تھے، تاہم والد کے سامنے اف تک نہ کی---

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں شامی لشکروں کے ساتھ، جو لڑائیاں وقتاً فوقتاً ہوتی رہیں، ان میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ، اپنے والد ماجد رضی اللہ عنہ کے ساتھ نہایت پامردی اور دلیری کے ساتھ کام کرتے رہے۔ ۴۹ھ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک لشکر قسطنطنیہ کے لیے تیار کیا، اس میں بھی سیدنا امام رضی اللہ عنہ شریک ہوئے---

جب آپ مجاہدین کے ساتھ میدان میں اترتے تو اپنے نانا جان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اپنے والد ماجد کی طرح، اگلی صفوں میں کھڑے ہوتے تھے۔ بلکہ آپ ان نڈر جوانوں میں سے تھے، جو عربی دستور جنگ کے مطابق عام لڑائی شروع ہونے سے پہلے، اکا دکا لڑائی کے لیے اپنے آپ کو پیش کرتے تھے۔ ایک دفعہ جنگ میں آپ نے آگے بڑھ کر "ھل من مبارز" کا نعرہ بلند کیا (یعنی کوئی مقابلے پہ آئے)، مخالف سمت سے ایک بڑا معروف جنگ جو زبرقان سامنے آیا، اس نے پوچھا:

"تم کون ہو؟" --- آپ نے فرمایا:

"میں حسین بن علی رضی اللہ عنہ ہوں" --- اس نے کہا:

میں آپ سے لڑنا نہیں چاہتا---

ان سطور سے معلوم ہوگا کہ ہمارے ممدوح امام عالی مقام رضی اللہ عنہ، عابد شب زندہ دار بھی تھے اور شجاع دل غازی اور مجاہد بھی تھے---

علم و فضل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے فیضان تربیت کا تیسرا اثر یہ تھا کہ آپ میں فہم قرآن اور درایت حدیث کے جوہر پیدا ہو گئے تھے، اسی طرح

شعر و سخن کا بلند پایہ ذوق بھی رکھتے تھے۔ خود شعر کہتے بھی تھے اور عرب شاعری پر فاضلانہ نظر کے مالک بھی تھے۔ عربوں کی ذہین اور اعلیٰ سوسائٹی کے افراد کے لیے خطابت اور عربیت پر قدرت، نہایت لازمی چیزیں تھیں اور ان میں بھی سیدنا امام رضی اللہ عنہ کا مقام مسلّم تھا---

قرآن حکیم کے مضامین آپ کے ذہن پر اس قدر غالب تھے کہ آپ کی باتیں اور آپ کے خطبے قرآنی حقائق کی چاشنی سے لبریز ہوتے تھے۔ سفر کربلا کے دوران جب فرزدق نے بتلایا کہ ''کوفیوں کے دل آپ کے ساتھ ہیں مگر ان کی تلواریں بنی امیہ کے ساتھ ہیں''--- اور اس کے بعد فرزدق نے یہ فقرہ بولا:

وَ الْقَضَاءُ یَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَ اللّٰہُ یَفْعَلُ مَا یَشَاءُ---

''قضاوقدر آسمان سے نازل ہوتی ہے اور خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے''---

تو جناب امام رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا:

صَدَقْتَ لِلّٰہِ الْاَمْرُ یَفْعَلُ مَا یَشَاءُ وَ کُلَّ یَوْمٍ رَبُّنَا فِیْ شَانٍ اِنْ نَزَلَ الْقَضَاءُ بِمَا نُحِبُّ فَنَحْمَدُ اللّٰہَ عَلٰی نَعْمَائِہٖ وَ ھُوَ الْمُسْتَعَانُ عَلٰی اَدَاءِ الشُّکْرِ---

''فرزدق! تم نے سچ کہا، معاملات اللہ ہی کے قبضے میں ہیں، جو وہ چاہتا ہے، وہی ہوتا ہے۔ ہمارا پروردگار ہر لحہ کسی حکم فرمائی میں ہے، اگر مشیت ہماری پسند کے مطابق ہو تو اس کی حمد و ثنا کریں گے''---

ان چند فقروں میں قرآن حکیم کے متعدد بنیادی تصورات آ گئے ہیں اور پھر ترکیبوں کی ساخت ایسی ہے کہ گویا قرآنی الفاظ کے نگینے، بلند پایہ عربی کی انگوٹھی میں کمال صنعت سے جڑ دیے گئے ہوں اور جو کچھ فرمایا ہے، برجستہ اور بلا تکلف فرمایا ہے،

تاہم یہ کلام عربیت خالصہ کے عظیم القدر نمونوں میں سے ایک ہے، تقریباً آپ کی تمام گفتگوؤں اور تقریروں میں اسی مذکورہ انداز کا غلبہ نظر آتا ہے۔ بعض مواقع پر واقعات کی کیفیت کے مطابق صرف آیات قرآنی ہی پڑھ دیا کرتے تھے اور درپیش ہونے والے معاملے کی مکمل تصویر کھنچ جاتی تھی۔ ۲۷ رجب المرجب کو جب مدینہ منورہ سے نکلے تو یہ آیتِ کریمہ پڑھی:

فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا يَّتَرَقَّبُ---[القصص]

''پس اس بستی سے بحالت خوف واحتیاط نکلے''---

اور ۳ شعبان المعظم کو مکہ کے قریب پہنچتے ہوئے یہ پڑھ رہے تھے:

وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَاءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسٰى رَبِّيْ اَنْ يَّهْدِيَنِيْ سَوَاءَ السَّبِيْلِ---[القصص]

''اور جب مدین کی طرف متوجہ ہوئے تو کہا، امید کہ پروردگار مجھے سیدھی راہ دکھادے گا''---

اسی طرح جب آپ کے قاصد قیس بن مسہر کی شہادت کی خبر آپ تک پہنچی تو آنکھیں تر ہوگئیں اور پڑھنے لگے:

فَمِنْهُمْ مَنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا---[الاحزاب]

''پس ان میں کچھ وہ ہیں جو اپنا کام ادا کر چکے (یعنی جانیں قربان کر چکے) اور کچھ باقی منتظر ہیں، انہوں نے ذرہ بھی تبدیلی نہ کی''---

یہ تمام اقتباسات کامل ابن اثیر، جلد۴ سے لیے گئے ہیں اور یہاں سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ قرآن کو کس قدر غائرانہ نگاہی اور حضور ذہن کے ساتھ پڑھتے تھے کہ جب چاہتے،

موقع کے مناسب قرآن حکیم کی خوشہ چینی فرما لیتے ---

سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کو احادیث کے یاد کرنے اور ان کی اشاعت کرنے کا خاصہ شغف تھا --- کتب حدیث میں آپ سے کئی روایات ایسی منقول ہیں، جو آپ نے خود حضور سرورِ عالم ﷺ سے سنی تھیں، اس کے علاوہ آپ نے علم حدیث کے سلسلے میں اپنے والد ماجد، اپنی والدہ محترمہ، اپنے ماموں ہند بن ابی ہالہ اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہم کی شاگردی اختیار کی ---

حدیث سیکھنے کے بعد رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے مطابق، آپ نے اسے دوسروں تک پہنچایا۔ چناں چہ جن حضرات نے آپ سے احادیث روایت کی ہیں، وہ درج ذیل ہیں:

حضرت حسن بن علی، علی بن حسین، زید بن حسین، سکینہ بنت حسین، فاطمہ بنت حسین، امام ابی جعفر باقر، امام شعبی، حضرت عکرمہ، کرز تیمی، سنان بن ابی سنان دوَلی، عبد اللہ بن عمرو بن عثمان، فرزدق اور دیگر بہت سے اصحاب --- [تہذیب التہذیب، جلد۲، صفحہ۳۴۵]

اس فہرست میں "سکینہ بنت حسین" اور "فاطمہ بنت حسین" کے نام ظاہر کرتے ہیں کہ حضرت امام گھر میں اپنی بچیوں تک کو احادیث یاد کراتے تھے اور امام ابو جعفر باقر، امام شعبی، حضرت عکرمہ اور فرزدق جیسے اسماء، سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے علمی پایہ پر دلالت کرتے ہیں کہ ایسے ایسے اربابِ علم و فضل آپ کے خوشہ چینوں میں تھے ---

شعر و شاعری میں بھی خوب دلچسپی لیتے تھے لیکن صرف پاکیزہ اور بلند مضمون اشعار کو پسند فرماتے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ کو عرب شاعری کا اکثر حصہ یاد تھا اور کبھی کبھی حسبِ مواقع اچھے شاعروں کے شعر اپنی گفتگو میں استعمال کرتے تھے۔ کربلا کی راہ میں

جب حر نے کہا:

"اگر آپ جنگ کریں گے تو قتل کیے جائیں گے"---

تو آپ نے فرمایا:

میں تیرے جواب میں رسول اللہ ﷺ کے ایک صحابی رضی اللہ عنہ کے وہ اشعار پڑھتا ہوں، جو انہوں نے جہاد پر جاتے ہوئے کہے تھے، جب کہ ان کا کافر بھائی انہیں روکتا تھا:

سَاَمْضِیْ وَ مَا بِالْمَوْتِ عَارٌ عَلَی الْفَتٰی
اِذَا مَا نَوٰی خَیْرًا وَ جَاهَدَ مُسْلِمًا
وَ وَاسَی رِجَالًا صَالِحِیْنَ بِنَفْسِهٖ
وَ خَالَفَ مَثْبُوْرًا وَ خَارَقَ مُجْرِمًا
فَاِنْ عِشْتُ لَمْ اَنْدَمْ وَ اِنْ مِتُّ لَمْ اُلَمْ
کَفٰی بِكَ ذُلًّا اَنْ تَعِیْشَ وَ تُرْغَمَا

[ابن اثیر، جلد ۴، صفحہ ۴۵]

"میں روانہ ہوتا ہوں، مرد کے لیے موت میں عار نہیں، جب اس کے عزائم
نیک ہوں اور وہ اسلام کے لیے جہاد کرنے والا ہو---
اور جب نیکوں پر اپنی جان قربان کرنے والا ہو اور مجرموں سے
الگ ہو جانے والا ہو---
پس اگر میں زندہ رہا تو ندامت نہ ہوگی اور اگر مر گیا تو ملامت بھی نہ ہوگی،
لیکن خواری کے ساتھ جینا سب سے بڑی ذلت ہے"---

کبھی کبھی آپ خود بھی شعر کہتے، آپ سے جو اشعار منقول ہیں، وہ عربی شعر کے اونچے درجے کا ایک حصہ ہیں۔ آپ نے دنیا کی حرص، مال اور فقر و غنٰی پر فرمایا ہے:

دَعِ الْحِرْصَ عَنِ الدُّنْیَا
وَفِی الْعَیْشِ فَلَا تَطْمَعْ
وَلَا تَجْمَعْ مِنَ الْمَالِ
فَلَا تَدْرِیْ لِمَنْ تَجْمَعْ
فَاِنَّ الرِّزْقَ مَقْسُوْمٌ
وَسُوْءُ الظَّنِّ لَا یَنْفَعْ
فَقِیْرٌ کُلُّ ذِیْ حِرْصٍ
غَنِیٌّ کُلُّ مَنْ یَّقْنَعْ

[مجموعة القصائد، صفحہ ۴۷]

''دنیا کی حرص اور زندگی کی لمبی امیدیں چھوڑ---
اور مال جمع کرنے میں ہی نہ لگا رہ، کیا خبر کس کے لیے جمع کر رہا ہے---
رزق کا فیصلہ تو ہو چکا اور بدگمانی سے کچھ حاصل نہیں ہوتا---
فقیر وہ ہے جو طمع میں مبتلا ہے اور غنی وہ ہے، جو صاحب قناعت ہو''---

چھوٹی بحر کے یہ اشعار، کس قدر آسان زبان اور دل کش انداز میں کہے گئے ہیں۔ ممکن نہیں کہ عربی شعر کا ذوق رکھنے والا، انہیں جھومے بغیر پڑھ جائے---

آپ نے کچھ اشعار، جنت کے بارے میں کہے تھے، ان میں سے دو شعر یہ ہیں:

سُتُوْرُهَا النُّوْرُ وَالْاَرْکَانُ مِنْ ذَهَبٍ
وَالْفَرْشُ اِسْتَبْرَقٌ خُضْرٌ حَوَاشِیْهَا
فَمَنْ یُرِدْ شِرَاهَا مَعَ تَقَلُّلِهٖ
فَلَیْلَةٌ بِدَوَامِ الصُّبْحِ یُحْیِیْهَا

''اس کے پردے نور کے اور ستون سونے کے ہیں۔ فرش استبرق کا ہے،
جس کے کنارے سبز ہیں---
پس جو شخص اپنی تنگ دستی کے باوجود اسے خریدنا چاہے، وہ راتوں میں
صبح تک عبادت کیا کرے''---

صرف ایک ہی شعر میں ایک ایسی چیز کا نقشہ آنکھوں کے سامنے رکھ دیا ہے، جسے
کوئی آنکھ دیکھ نہیں سکتی اور کوئی کان سن نہیں سکتا---

قیامِ کربلا کی آخری رات میں، جب آپ تلوار صاف فرما رہے تھے، تو طبیعت نے
نیرنگیٔ زمانہ پر یہ شعر موزوں کیے:

یَا دَهْرُ اُفٍّ لَكَ مِنْ خَلِيْلٖ
كَمْ لَكَ بِالْاِشْرَاقِ وَالْاَصِيْلٖ
مِنْ صَاحِبٍ اَوْ طَالِبٍ قَتِيْلٖ
وَالدَّهْرُ لَا يَقْنَعُ بِالْبَدِيْلٖ
وَاِنَّمَا الْاَمْرُ اِلَى الْجَلِيْلٖ
وَكُلُّ حَيٍّ سَالِكُ السَّبِيْلٖ

[ابن اثیر، جلد ۴، صفحہ ۳۰]

''اے زمانے! تو کیا بے وفا دوست ہے، ہر صبح اور ہر شام، تیرے ہاتھوں
کتنے مارے جاتے ہیں---
اور یہ زمانہ کسی سے عوض قبول نہیں کرتا---
دراصل سارا معاملہ تو خدائے جلیل کے ہاتھ میں ہے اور ہر زندہ شخص
موت کی راہ پر چل رہا ہے''---

زمانے، زندگی اور خدا کے متعلق عرب شاعروں نے جو کچھ کہا ہے، وہ سارا ذخیرہ سامنے رکھیے اور پھر دیکھیے کہ کربلا کی خاموش راتوں میں گنگنانے والے شاعر کی ان صداؤں کا کیا مقام ہے؟---

آپ کی شاعری کے تذکرے کے آخر میں وہ غیر فانی اشعار درج کرتا ہوں، جو آپ کی زندگی کے آخری شعر ہیں اور جو تلواروں کی جھنکار میں پکارے گئے تھے۔ جب خاندان رسول ﷺ کے تمام بہادر کٹ چکے تھے اور آپ تن تنہا، دشمن کی صفوں میں اہل بیت کی شجاعت کی روایات دہرا رہے تھے، اس وقت آپ اپنا جنگی ترانہ یوں پڑھ رہے تھے:

أَنَا ابْنُ عَلِيِّ الْخَيْرِ مِنْ آلِ هَاشِمِ
كَفَانِيْ بِهٰذَا مَفْخَرًا حِيْنَ أَفْخَرُ
وَ جَدِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ أَكْرَمُ مَنْ مَشٰى
وَ نَحْنُ سِرَاجُ اللّٰهِ فِي النَّاسِ أَزْهَرُ
وَ فَاطِمَةُ أُمِّيْ سُلَالَةُ أَحْمَدَ
وَ عَمِّيْ يُدْعٰى ذَا الْجَنَاحَيْنِ جَعْفَرُ
وَ فِيْنَا كِتَابُ اللّٰهِ أُنْزِلَ صَادِقًا
وَ فِيْنَا الْهُدٰى وَ الْوَحْيُ وَ الْخَيْرُ يُذْكَرُ

''میں اس علی (رضی اللہ عنہ) کا فرزند ہوں، جو بنی ہاشم میں بہترین تھے۔
نسبی فخر کے وقت، یہی بات میرے لیے باعث افتخار ہے---
اور میرے نانا رسول خدا (ﷺ) ہیں، جو ساری خلق سے افضل ہیں
اور ہم لوگ انسانیت کے لیے روشن چراغ ہیں---

اور میری والدہ، وہ فاطمہ (رضی اللہ عنہا) ہیں، جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا جگر پارہ تھیں اور میرے چچا حضرت جعفر طیار ذوالجناحین رضی اللہ عنہ ہیں---

ہمارے گھر میں اللہ کی سچی کتاب نازل ہوئی اور ہمارے ہی گھرانے میں ہدایت، وحی اور نیکی کا چرچا رہتا ہے"---

گفتگو، خطابت اور تحریر

علم و فضل کی جو دولت، آپ نے اپنے گھرانے سے پائی تھی، اس کے اثرات آپ کی گفتگو اور تحریر و تقریر میں نہایت واضح نظر آتے ہیں۔ عربوں میں گفتگو اور مراسلے میں اختصار اور جامعیت کو پسند کیا جاتا تھا، لیکن تقریر اور خطبہ میں فصاحت و بلاغت، زبان دانی اور قادر الکلامی کے کمالات دکھائے جاتے تھے۔ اس معیار کو مدنظر رکھتے ہوئے، سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کی گفتگوؤں اور ان کے خطبوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زبان پر مکمل قدرت بلکہ حکومت حاصل ہونے کے ساتھ، آپ وقت کے ادبی معیار سے بھی آگاہ تھے۔ آپ کی عام گفتگو کا یہ عالم تھا کہ صرف چند لفظوں میں پورا مدعا اس طرح بیان فرما دیتے کہ اس پر ایک لفظ کا اضافہ بھی ناممکن ہوتا۔ مدینہ منورہ کے عامل نے جب آپ کو تنہائی میں بلا کر، بیعت کا مطالبہ کیا تو آپ کا جواب یہ تھا:

مِثْلُنَا لَا یُبَایِعُ سِرًّا---[الاستیعاب، جلد ۱، صفحہ ۱۴۴]

"ہم لوگ، خفیہ بیعت نہیں کر سکتے"---

اس جواب پر، حاکم مدینہ لاجواب ہو گیا---

کوفہ جاتے ہوئے، جب شہادت مسلم کی خبر آئی تو بعض ساتھیوں نے کہا،

اب واپس جانا چاہیے۔لیکن حضرت مسلم رضی اللہ عنہ کے بھائیوں نے کہا:

"نہیں بخدا، یا تو ہم انتقام لیں گے،نہیں تو ہم خود بھی شہید ہوں گے"---

اس پر آپ نے اپنا فیصلہ،صرف ان الفاظ میں سنا یا دیا:

لَا خَيْرَ فِي الْحَيَاةِ بَعْدَكُمْ ---[تہذیب التہذیب،صفحہ۳۵۲]

"تمہارے بعد زندگی میں کچھ بھلائی نہیں"---

میدان کربلا میں خیموں کی حفاظت کے لیے آپ نے حکم دیا کہ اردگرد خندق کھود کر اس میں آگ جلادی جائے،جب آگ بھڑکی تو ایک کوفی بدبخت نے کہا:

تَعَجَّلْتَ النَّارَ فِي الدُّنْيَا---

"تم نے دنیا میں ہی آگ اختیار کرلی"---

یہ طعنہ سن کر آپ نے فرمایا[۱]:

اَنْتَ اَوْلٰى بِهَا صِلِيًّا---[کامل،صفحہ۳۱]

"اس میں جلنے کے زیادہ مستحق تم ہو"---

فرات کے کنارے پر آپ نے عمرو بن سعد کے ساتھ حالات پر گفتگو کرتے ہوئے، اپنی تین اہم شرطیں پیش کی تھیں اور الفاظ صرف یہ تھے:

اِمَّا اَنْ تَدَعُونِيْ فَاَلْحَقُ بِالثُّغُوْرِ وَاِمَّا اَنْ تَدَعُونِيْ فَاَذْهَبُ اِلٰى يَزِيْدَ وَاِمَّا اَنْ تَدَعُوْنِيْ فَاَذْهَبُ مِنْ حَيْثُ جِئْتُ---[تہذیب،صفحہ۳۵۲]

"یا مجھے سرحدوں کی طرف جانے دو یا مجھے یزید کے پاس پہنچنے دو

[۱]......"سعادت الکونین" نے طبری کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس گستاخ کا گھوڑا کودا اور اسے خندق میں گرادیا، جہاں وہ جل کر راکھ ہوگیا---

(تا کہ براہ راست گفتگو ہو سکے) اور یا مجھے واپس جانے دو"---

یہ تین فقرے تھے، لیکن عالم اسلام کی ساری کش مکش کا حل ان میں بند تھا۔ پھر مضمون کی اہمیت اور نزاکت کے باوجود، اسے کس قدر سادہ، سلیس اور مختصر الفاظ میں ادا کر دیا گیا---

اسی طرح آپ کے خطوط میں الفاظ بہت کم، معانی بہت زیادہ اور مطالب نہایت واضح ہوتے تھے، آپ کے بعض خطوط کا متن آئندہ ابحاث میں آ رہا ہے۔ خطابت عربوں کا محبوب وصف تھا، قریش اور خصوصاً بنو ہاشم میں ہمیشہ بلند پایہ خطیب پیدا ہوتے رہے---

امام عالی مقام رضی اللہ عنہ کے لیے یہ وصف خاندانی وراثت کی حیثیت رکھتا تھا، حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خطابت تو مسلم تھی، پھر حضرت حسن رضی اللہ عنہ بھی مؤثر خطیب تھے۔ ایک دفعہ آپ نے ایک ایسے مجمع سے خطاب فرمایا، جو حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی پیروی سے ہٹنا چاہتا تھا مگر آپ کی تقریر کا اثر یہ تھا کہ ہزارہا لوگ بیعت کرنے لگے اور جہاد کے لیے تیار ہو گئے۔ سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ بھی نہایت پرتاثیر اور مسکت [ا] تقریر فرماتے تھے۔ آپ نے آواز بھی بلند پائی تھی اور انداز بھی خطیبانہ تھا---

میدان کربلا میں دشمنوں کی قطاروں کے سامنے آپ نے خطبہ ارشاد فرمایا:

اَیُّھَا النَّاسُ! اِسْمَعُوْا قَوْلِی وَلَا تَعْجَلُوْنِی حَتّٰی اَعِظَکُمْ بِمَا یَجِبُ لَکُمْ عَلَیَّ وَحَتّٰی اَعْتَذِرَ اِلَیْکُمْ مِنْ مَقْدَمِی عَلَیْکُمْ فَاِنْ قَبِلْتُمْ عُذْرِی وَصَدَّقْتُمْ قَوْلِی وَاَنْصَفْتُمُوْنِی کُنْتُمْ بِذٰلِکَ

[ا]......آپ کوفیوں کے سامنے تقریر کرتے، پھر سوال کرتے کہ "کیا میں غلط کہتا ہوں" لیکن ادھر سناٹا چھا جاتا تھا اور کوئی جواب نہ آتا تھا---

اَسۡعَدَ وَلَمۡ یَکُنۡ لَکُمۡ عَلَیَّ سَبِیۡلٌ وَاِنۡ لَّمۡ تَقۡبَلُوۡا مِنِّیَ الۡعُذۡرَ فَاَجۡمِعُوۡا اَمۡرَکُمۡ وَشُرَکَاءَ کُمۡ ثُمَّ لَا یَکُنۡ اَمۡرُکُمۡ عَلَیۡکُمۡ غُمَّۃً ثُمَّ اقۡضُوۡا اِلَیَّ وَلَا تُنۡظِرُوۡنِ اِنَّ وَلِیِّیَ اللّٰہُ الَّذِیۡ نَزَّلَ الۡکِتٰبَ وَھُوَ یَتَوَلَّی الصّٰلِحِیۡنَ---[کامل، جلد۴، صفحہ۳۱]

''اے لوگو! میری بات سن لو، جلدی نہ کرو۔ مجھے نصیحت کرنے دو، اپنا عذر کہنے دو، آمد کی وجہ بیان کرنے دو، اگر تم میری معذرت مان لو اور میری بات کی تصدیق کرو اور میرے ساتھ انصاف کرو تو تم بڑے خوش بخت ہو گے اور تم میری مخالفت سے باز آ جاؤ گے۔ لیکن اگر تم میری معذرت قبول نہ کرو، تو پھر تم اور تمہارے ساتھی ایکا کر لو، تمہارا معاملہ شبہ میں نہ رہے، پھر مجھ پر ٹوٹ پڑو اور ذرا مہلت نہ دو۔ میرا والی وہ اللہ ہے، جس نے قرآن اتارا اور وہی نیکوں کا حامی ہے''---

ہر فقرے میں قرآن کے الفاظ جگمگا رہے ہیں، ہر ترکیب ''عَرَبِیٌّ مُّبِیۡنٌ'' کا نمونہ پیش کر رہی ہے۔ فصاحت و بلاغت کی حد ختم ہو رہی ہے اور تاثیر کی بجلی، تقریر کے ہر گوشے میں چمک رہی ہے اور پھر یہ آواز اس خطیب کی ہے، جو منبر پہ نہیں بلکہ موت کی بدلیوں میں گھر کر زین گھوڑے پہ بیٹھا ہوا، گونج رہا ہے ؏

جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

اخلاق و خصائص

آپ کے اخلاق نہایت اعلیٰ اور عادات نہایت پاکیزہ و شائستہ تھیں کیوں کہ آپ

اس ہستی کی آغوش میں کھیلے تھے، جن کا مشن ہی انسان کے اخلاق واطوار کو سدھارنا تھا۔

سیّدنا حسین رضی اللہ عنہ اپنے نانا جان کی طرح نہایت سخی اور غریب پرور واقع ہوئے تھے۔

ایک دفعہ ایک تنگ دست بدوی مدینہ طیبہ میں آیا اور پوچھنے لگا:

اس شہر میں سب سے بڑا سخی کون ہے؟---لوگوں نے آپ کا پتہ دیا، جب سائل دروازے پر پہنچا، آپ نے خادم سے کہا:

دیکھو تو گھر میں کتنی رقم ہے، اس نے عرض کی:

چار ہزار اشرفیاں---فرمایا:

''سب اٹھا کر اس شخص کو دے دو، کیوں کہ یہ ہم سے زیادہ ضرورت مند ہے''---

جو شخص احسان کرتا، اسے ہمیشہ یاد رکھتے اور اس کے احسان کا بدلہ ادا فرماتے۔

ایک دفعہ آپ، حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ کے ساتھ حج کے لیے جا رہے تھے، راستے میں زادِ راہ ختم ہو گیا اور بھوک پیاس نے ستایا، اسی حالت میں ایک بڑھیا کی جھونپڑی نظر آئی، چناں چہ آپ اس کی طرف بڑھے، بڑھیا نے اپنی بکری کا دودھ دوھ کر پیش کیا اور پھر وہی بکری ذبح کر کے کھانا تیار کیا۔ کھانے پینے سے فارغ ہو کر آپ مکہ کو روانہ ہوئے اور حج سے فارغ ہو کر بعافیت تمام مدینہ واپس پہنچ گئے۔

کافی عرصہ گزر جانے کے بعد وہی بڑھیا اتفاق سے مدینہ منورہ آئی، امام حسین رضی اللہ عنہ اور دوسرے بھائیوں نے بڑھیا کو پہچان لیا، چناں چہ ہزار ہزار بکری اور ہزار ہزار درہم دے کر بڑھیا کو نہایت عزت وتکریم کے ساتھ رخصت کیا گیا---

حضرت انس رضی اللہ عنہ بتلاتے ہیں کہ ایک دن میں حضرت امام کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک کنیز نے پھولوں کا ایک گل دستہ لا کر پیش کیا، گل دستہ ہاتھ میں لے کر

حضرت نے سونگھا اور کنیز سے ارشاد فرمایا:

"جا تو اللہ کی راہ میں آزاد ہے"---

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، میں نے عرض کی:

"آپ نے ایک گل دستے پہ کنیز کو آزاد کردیا"---

آپ نے فرمایا، قرآن کریم میں حکم ہے:

اِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَا---

"یعنی جب تمہیں اچھی چیز پیش کی جائے تو تم اس سے بھی اچھی پیش کش کرو"---

آپ کی سخاوت اور دریا دلی کا یہ عالم تھا کہ بعض اوقات شاعروں کو بڑی بڑی رقمیں عطا فرمادیا کرتے تھے۔ایک روایت میں ہے کہ کسی ایسے موقع پر آپ کے بڑے بھائی حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے آپ کی اس بات پر تنقید کی اور ناراضگی ظاہر فرمائی کہ تم خواہ مخواہ ان لوگوں کو انعام دیتے رہتے ہو، اس پر سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ نے کہا:

"بھائی جان! آپ مجھ سے اس حقیقت کو زیادہ بہتر جانتے ہیں کہ اچھا مال وہ ہے، جس کے ذریعے عزت کی حفاظت کی جائے"---

آپ کا مفہوم یہ تھا کہ ان کے منہ میں ٹکڑا دینا بہتر ہوتا ہے تا کہ برائی اور ہجو سے ان کی زبان رکی رہے۔خاندان کے تعلقات اور حقوق کا بہت زیادہ خیال رکھا کرتے تھے، خاندان کے ہر چھوٹے بڑے فرد سے انتہائی محبت رکھتے تھے، یہی وجہ تھی کہ آپ ہر صغیر و کبیر کی محبت کا مرکز تھے، گویا پورے خاندان کی روح رواں تھے---

اس بات کا اندازہ سفر کربلا سے بھی ہوتا ہے کہ گھر کا ہر چھوٹا بڑا، آپ کے ساتھ جانیں نثار کرنے کے لیے گھر سے نکل کھڑا ہوا اور راستے میں جب آپ کہتے کہ تم لوگ

اپنی جانیں بچا کر نکل جاؤ تو ان کا جوشِ محبت اور بھی ابھرتا اور وہ کہتے کہ آپ کے بعد ہم زندہ رہ کر کیا کریں گے---

سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ، اپنے بڑے بھائی حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کا از حد احترام ملحوظ رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ کوئی ایسی بات پیش آئی کہ بڑے بھائی کچھ رنجیدہ سے ہو گئے، ایک آدھ دن یونہی گزر گیا تو امام حسین رضی اللہ عنہ بہت مضطرب ہوئے، جی چاہا کہ بھائی کے پاس فوراً چلے جائیں، لیکن ایک حدیث پاک یاد آ گئی، جس کی رو سے خود رک گئے اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی خدمت میں یہ پیغام بھیجا:

"میں آپ کو راضی کرنے کے لیے پہل کرنا چاہتا تھا مگر نانا جان کا فرمان یاد آ گیا ہے کہ جو شخص اپنے رنجیدہ بھائی کو راضی کرنے میں پہل کرتا ہے، وہ جنت میں بھی اس سے پہلے داخل ہوگا اور میں یہ بات پسند نہیں کرتا کہ جنت جانے میں آپ سے پہل کروں، کیوں کہ آپ بڑے ہیں لہٰذا آپ خود میرے ہاں تشریف لائیے"---

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ یہ پیغام سنتے ہی چھوٹے بھائی کے پاس چل کر آ گئے اور دونوں بھائی فرطِ محبت سے ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ یہاں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان حضرات کے سینے کس قدر صاف اور دل کیسے پاک تھے---

رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ

اپنے سوتیلے بھائی سیدی محمد بن الحنفیہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی بڑی محبت فرماتے تھے، جب مدینہ طیبہ میں بیعت کا مطالبہ شروع ہوا تو آپ نے پیش آمدہ حالات کے متعلق انہی سے مشورہ کیا اور پھر مکہ کی طرف روانگی ان کے مشورے کے مطابق عمل میں آئی---

آپ کو حضرت عبداللہ بن جعفر (چچا زاد بھائی) سے بڑا پیار تھا۔ جب آپ

مکہ سے کوفہ جانے والے راستے پر چل پڑے تو عبداللہ، حاکم مدینہ سے امان کا خط لکھوا کر، مدینہ سے دوڑے، راستے میں آپ کو آ روکا اور مدینہ جانے کے لیے اصرار کیا، لیکن آپ کو رضامند نہ کر سکے۔ تاہم اپنی وفا کی نشانی کے طور پر، اپنے دو بیٹے آپ کے ساتھ شریک سفر کر دیے، جو کربلا میں شہید ہو گئے---

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اور سیدہ زینب رضی اللہ عنہا میں جو محبت تھی، وہ محتاج بیان نہیں۔ آپ اپنی ازواج اور اولاد سے بھی گہری محبت و شفقت رکھتے تھے۔ اپنی ایک بیٹی سیدہ سکینہ (فداہا امی) اور ان کی والدہ حضرت رباب سے آپ کو خاص الفت تھی۔ آپ کا ایک شعر ہے:

لَعَمْرِیْ اِنَّنِیْ لَاُحِبُّ اَرْضًا
تَحِلُّ بِھَا السَّکِیْنَۃُ وَالرَّبَابُ

''مجھے جان کی قسم! میں اس سرزمین سے محبت رکھتا ہوں، جہاں سکینہ اور رباب بستی ہیں''---

آپ اپنے بچوں سے محبت بھی کرتے تھے مگر ان کی تربیت کا بھی پورا خیال رکھتے تھے۔ پیچھے علم و فضل کے باب میں معلوم ہو چکا ہے کہ آپ اپنے بیٹوں علی اور زید اور بیٹیوں سکینہ اور فاطمہ کو حدیثیں یاد کراتے تھے---

صفات عالیہ

آپ کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ میں وہ صفات عالیہ جمع فرما دی تھیں، جو عظیم انسانوں میں پائی جاتی ہیں۔ پیچھے آپ کے جود و سخا کا ذکر ہوا،

اس کے بعد آپ کی جرأت اور استقلال کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ دراصل یہ دونوں وصف آپ میں فطری تھے، حضور سرورِ عالم ﷺ کے ایک فرمان کا ثمرہ تھے---

تہذیب التہذیب میں ہے کہ حضور ﷺ کی آخری بیماری کے دنوں میں، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اپنے دونوں بیٹے ساتھ لیے، حاضرِ خدمت ہوئیں اور عرض کی:

فَقَالَتْ لَهٗ هٰذَانِ ابْنَاكَ فَوَرِّثْهُمَا شَيْئًا قَالَ اَمَّا حَسَنٌ فَاِنَّ لَهٗ هَيْبَتِيْ وَ سُؤْدَدِيْ وَ اَمَّا حُسَيْنٌ فَاِنَّ لَهٗ جُرْاَتِيْ وَ جُوْدِيْ---

[تہذیب التہذیب، جلد ۲، صفحہ ۳۴۵]

''(حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا) بولیں، یہ آپ کے بیٹے ہیں، انہیں کچھ وراثت عطا فرمائیے---حضور ﷺ نے فرمایا:

''حسن رضی اللہ عنہ کو میری ہیبت اور سرداری ملی ہے اور حسین رضی اللہ عنہ کو میری جرأت اور سخاوت ملی ہے''---

آپ کی جرأت کا یہ عالم تھا کہ بچپن کے زمانے میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جیسی شخصیت کو بھرے مجمع [ا] میں کہہ دیا---

''میرے نانا کے منبر سے اتریئے''---

اسی جرأت اور استقلالِ طبع کا نتیجہ تھا کہ تاریخ کے بہت بڑے المیہ، سانحہ کربلا میں آپ کا عظیم کردار، روشنی کے مینار کی طرح درخشاں نظر آتا ہے۔ دنیا کا ہر انسان اس واقعہ کی تفصیلات سن کر کانپ اٹھتا ہے مگر کمال ہمت و استقلال ہے آپ کا کہ

[ا]...... یہ بات محض بچپن کے بھولے پن کی وجہ سے تھی۔ بعد میں فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے پوچھا تھا، آپ کو یہ بات کس نے سکھائی تھی؟ تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا:
''کسی نے نہیں، میں نے از خود کہی تھی''---

گھرانے کے سب چھوٹے بڑے شہزادے، خون میں لیٹے ہوئے ہیں لیکن آپ کے ماتھے پہ شکن نہیں پڑتی، منہ سے اف نہیں نکلتی اور اپنے موقف سے بال برابر پیچھے نہیں ہٹتے اور ان دل دوز حالات میں، دشمن کی ہر بات کا بے باکی سے جواب دیتے ہیں۔ ان کے سامنے تقریریں کرتے ہیں اور شمشیر بدست، صفوں میں گھس جاتے ہیں۔ جرأت اور بے خوفی کا یہ وصف آپ کے ہر ساتھی میں بھی پیدا ہو گیا تھا۔ واقعات کربلا میں حضرت مسلم، قیس بن مسہر اور عبداللہ بن یقطر رضی اللہ عنہم کے حالات دیکھیے، ان لوگوں نے زیاد جیسے جابر اور خوں خوار کے سامنے اس طرح کلمہ حق کہا کہ تاریخ کبھی نہ بھولے گی---

سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ فنون جنگ میں بھی اعلیٰ بصیرت کے مالک تھے۔ کربلا کا میدان بالکل چٹیل تھا، کوئی آڑ نہ تھی اور کوئی مورچہ نہ بنایا جا سکتا تھا۔ تاہم آپ نے اپنی جنگی بصیرت سے کئی تدبیریں نکال لیں۔ آپ نے اپنی فوج کے عقب پر تمام خیمے اکٹھے کر کے ایک دیوار سی بنا دی تھی تا کہ دشمن پچھلی طرف سے حملہ نہ کر سکے اور خیموں کے ارد گرد خندق کھود کر اس میں آگ بھر دی، یہ خیموں کی حفاظت کی تدبیر تھی۔ جنگ شروع ہوئی تو پہلے آپ نے کافی دیر تک انفرادی جھڑپوں کا سلسلہ جاری رکھا، جس میں دشمن کا کافی نقصان ہوا، پھر جب کوفیوں کی گھوڑ سوار فوج ایک دم آگے بڑھی تو آپ نے اپنے جوانوں کو حکم دیا کہ زمین پر گھٹنے ٹیک کر بیٹھ جاؤ اور نیزے دشمن کے رخ پر تانے رکھو، اس طرح سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑے، نیزوں کی انیوں سے زخمی ہو گئے اور مجبوراً اس رسالے کو پسپا ہونا پڑا---

اسلام کے دلیر، نڈر، مستقل مزاج اور دانا سپاہی ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت سیدنا حسین رضی اللہ عنہ خدا کے مطیع و مخلص اور اس سے بہت زیادہ ڈرنے والے بندے تھے۔

راتوں کی تنہائی میں اللہ کی یاد کرتے، نماز میں روتے اور تلاوت میں بھی آنکھیں تر رہتیں۔

نماز، قرآن اور حج سے آپ کو محبت تھی۔ آپ نے اپنی زندگی میں پچیس حج کیے تھے۔

آپ خدا کی مخلوق، خصوصاً ضعیفوں اور کمزوروں کے ساتھ شفقت اور مہربانی کا سلوک کرتے، ماتحتوں کی خطائیں معاف کر دیتے---

ایک دن آپ کے ہاں چند معززین کی دعوت تھی، ایک غلام نے ایک قیمتی کٹورا لاپرواہی سے توڑ دیا۔ آپ نے اس کی طرف دیکھا، تو اس نے یہ آیت پڑھی:

وَ الْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ---

''غصے کو پی جانے والے''---آپ نے فرمایا:

کَظَمْتُ غَیْظِیْ---

''میں نے اپنا غصہ پی لیا''---اس نے اگلا ٹکڑا پڑھا:

وَ الْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ---

''اور لوگوں کو معاف کرنے والے''---آپ نے فرمایا:

عَفَوْتُ عَنْكَ---

''میں نے تجھے معاف کیا''---غلام نے آگے پڑھا:

وَ اللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ---

''اور اللہ احسان کرنے والے کو پسند کرتا ہے''---آپ نے فرمایا:

''جا! تجھے اللہ کے لیے آزاد کیا''---

حاجت مندوں اور تنگ دستوں کو دیکھ کر آپ کا دل تڑپ جاتا تھا۔ فرزوق شاعر کو مروان نے شہر بدر کرنے کا حکم دیا، وہ نہایت بے سروسامانی میں آپ کے ہاں پہنچا، آپ نے چار ہزار اشرفیاں دے کر رخصت کیا---

ایک دن آپ کو خبر ملی کہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ[۱] بیمار پڑے ہیں، آپ بیمار پرسی کے لیے گئے اور دیکھا کہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ سخت مضطرب ہیں۔ آپ نے وجہ پوچھی، وہ کہنے لگے، مجھ پر ساٹھ ہزار درہم ہے اور موت قریب آ پہنچی ہے۔ آپ نے فرمایا:

"مطمئن رہیے، میں ابھی بندوبست کرتا ہوں"---

یہ کہہ کر اٹھے اور اسی وقت قرض خواہوں کے پاس جا کر ساٹھ ہزار کی رقم اپنے پاس سے ادا کر دی---

ایک دفعہ آپ کو بیت المال سے ایک بڑی رقم ملی، آپ وہ رقم لے کر مسجد میں بیٹھ گئے اور کسی ضرورت مند شخص کا انتظار کرنے لگے۔ ایک آدمی بولا:

آپ کا لباس پھٹا ہوا ہے، آپ یہ رقم اس پر صرف کیجیے--- آپ نے فرمایا:

"اپنی آرائش پر خرچ کرنے سے زیادہ بہتر یہی ہے کہ یہ رقم کسی محتاج کی حاجت میں صرف ہو جائے"---

آپ فرمایا کرتے تھے:

"اس بات کو خدا کا انعام سمجھا کرو کہ لوگ تمہارے پاس اپنی حاجات لے کر آئیں، لہٰذا حاجت مندوں کی حاجت پوری کیا کرو"---

ایک دن ایک غریب دیہاتی نے آپ کے دروازے پر اونٹنی کھڑی کی اور یہ شعر لکھ کر اندر بھیجے:

لَمْ یَبْقَ لِیْ شَیْءٌ یُبَاعُ بِحَبَّةٍ
فَکَفَاكَ مُظْهِرُ حَالَتِیْ عَنْ مُخْبِرِیْ

---

[۱]......حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے محبوب صحابی، حضرت زید رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے تھے۔ اسامہ رضی اللہ عنہ، حضرات حسن و حسین رضی اللہ عنہما کے بچپن کے ساتھی تھے۔ انہیں بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گود میں بیٹھنے کا شرف حاصل تھا---

اَبْقَیْتُ مَاءَ الْوَجْهِ کُنْتُ صَنَنْتُهَا
مِنْ اَنْ یُبَاعَ فَقَدْ وَجَدْتُّ الْمُشْتَرِیْ

”میرے پاس کوئی ایسی چیز بھی نہ رہی، جس سے ایک دانہ خرید ا جا سکے۔ میری حالت آپ پر ظاہر ہے، بتانے کی حاجت نہیں۔ میں نے اپنی آبرو بچا رکھی تھی، اسے کسی کے ہاتھ فروخت کرنا پسند نہ کرتا مگر اب خریدار مل گیا ہے“---

اتفاق سے جواب آنے میں ذرا زیادہ دیر لگ گئی اور اعرابی نے چار مصرعے اور لکھ بھیجے:

مَا ذَا اَقُوْلُ اِذَا رَجَعْتُ وَقِیْلَ لِیْ
مَا ذَا اَصَبْتَ مِنَ الْجَوَادِ الْمُفَضِّل
اِنْ قُلْتُ اَعْطَانِیْ کَذِبْتُ وَاِنْ اَقُلْ
بَخِلَ الْجَوَّادُ بِمَالِهٖ لَمْ یُقْبَل

”جب میں لوٹوں گا اور مجھ سے پوچھیں گے کہ صاحب فضل سخی سے تجھے کیا ملا؟ تو کیا جواب دوں گا۔ اگر کہوں کہ مجھے دیا ہے، تو جھوٹ ہوگا اور اگر کہوں کہ سخی نے اپنا مال روک لیا ہے، تو یہ بات مانی نہ جائے گی“---

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے دس ہزار درہم کی تھیلی بھیجی اور یہ اشعار بھی ارقام فرمائے:

عَاجَلْتَنَا فَاَتَاكَ اَقَلِّلُ بِرِّنَا
کَلَّا وَاِنْ اَمْهَلْتَنَا لَمْ تُقْلِل
خُذْهَا وَکُنْ اَنْتَ کَمَا لَمْ تَسْئَل
وَنَکُوْنُ نَحْنُ کَاَنَّمَا لَمْ نَفْعَل

"تم نے جلدی مچادی، سوتمہیں یہ قلیل صلہ مل گیا ہے اور اگر تم جلدی نہ کرتے تو تمہیں بہت زیادہ ملتا۔ اب یہ لے لو اور یوں سمجھنا کہ تم نے سوال ہی نہیں کیا اور ہم سمجھیں گے کہ گویا ہم نے کچھ دیا ہی نہیں"---

وہ پردیسی رقم لے کر دعائیں دیتا ہوا چلا گیا---

اپنے محبوب نانا ﷺ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ بھی غرباء، فقراء اور مساکین سے دلی محبت رکھتے تھے، ضعیفوں اور تنگ دستوں کی مدد فرماتے تھے۔

ایک فارسی مصنف کے الفاظ ہیں:

اہل اخبار اتفاق دارند کہ وے رضی اللہ عنہ در مہمان نوازی وغریب پروری و اعانت مظلوم وایصال رحم وانعام فقراء ومساکین مشہور آفاق بود برہنہ تناں وحاجت منداں را از نقد وپارچہ امداد فرمودے---

"سیرت نگار بالاتفاق کہتے ہیں کہ آپ مہمان نوازی، غریب پروری، مظلوموں کی مدد، صلہ رحمی اور فقراء ومساکین پر نعمتیں تقسیم کرنے میں مشہور عالم تھے، بے سروسامان اور حاجت مندوں کی، کپڑے اور نقدی سے مدد فرمایا کرتے تھے"---

بیواؤں اور یتیموں کی خبر گیری کرتے تھے، ان کے کام اپنے ذمے لے رکھے تھے۔

حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"ابا جان یتیموں اور بیوہ عورتوں کے لیے کھانا اور ان کی ضروریات خود اٹھا کر ان کے گھروں تک پہنچاتے تھے، حتی کہ آپ کی پشت مبارک پر نشان پڑ جایا کرتے تھے"---

ان چند سطور کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ اسلامی اخلاق کا پیکر کامل اور اپنے وقت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کا صحیح عملی نمونہ تھے، میں دعا کرتا ہوں کہ خدائے کریم مجھے اور سب مسلمانوں کو اس سیرت طاہرہ سے مستفید ہونے کی توفیق بخشے، آمین---

• تاریخ کربلا

- **مدینۃ النبی سے فرات کے کنارے تک**
- **ریگ کربلا سے تخت دمشق تک**

نقشِ الا اللہ بر صحرا نوشت
سطرِ عنوانِ نجاتِ ما نوشت

[علامہ اقبال]

مدینۃ النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے فرات کے کنارے تک

مطالبۂ بیعت

۶۰ھ میں یزید نے تختِ شام پر قدم رکھتے ہی عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے معاملے کی طرف توجہ کی اور اپنے حاکم مدینہ ولید کو لکھا کہ ابن زبیر اور حسین رضی اللہ عنہما سے جلد بیعت لے لو۔ بیعت کا مطالبہ ہوتے ہی ابن زبیر رضی اللہ عنہ مکہ منتقل ہو گئے اور حضرت امام رضی اللہ عنہ نے ولید [۱] کو کہا کہ یہ معاملات خفیہ نہیں ہوتے---

[۱]......ولید نے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو بلا بھیجا، آپ اپنی فراست سے سمجھ گئے کہ بیعت کا معاملہ ہوگا۔ چناں چہ چند مسلح آدمی ساتھ لیے، ان کو دروازے پر بٹھایا، خود اندر گئے۔ ولید نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کی خبر سنائی اور یزید کی بیعت کا مطالبہ کیا۔ آپ نے پہلے انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھا۔ امیر معاویہ کے لیے رحمت کی دعا مانگی--- پھر فرمایا:
''مجھ جیسا شخص خفیہ بیعت نہیں کر سکتا''---[الحسین]

بھائی کا مشورہ

حکومت اس معاملہ میں سختی کرنا چاہتی تھی اور امام حسین رضی اللہ عنہ کے لیے دور ابتلا آ چکا تھا۔ آپ صورت حال پر غور کر رہے تھے کہ آپ کے بھائی حضرت محمد بن حنفیہ [ا] نے مشورہ دیا کہ:

”زمانہ پرآشوب ہے، کہیں بھی امن نہیں، البتہ آپ مکہ مکرمہ تشریف لے جائیں، اگر وہاں بھی چین نہ لینے دیا جائے تو آپ ریگستانوں اور پہاڑوں میں نکل جائیں اور جب تک ملک کا کوئی فیصلہ نہ ہو جائے، ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہیں۔ اتنے میں واقعات کی تاریکی ہٹ جائے گی اور آپ اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کر سکیں گے کیوں کہ جب واقعات در آتے ہیں تو آپ کی رائے بہت زیادہ صائب ہوتی ہے“---

[کامل ابن اثیر، جلد۴، صفحہ۸، طبری]

روضہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر دعا مانگی

بھائی کا مخلصانہ مشورہ سن کر جناب امام رضی اللہ عنہ نے سفر مکہ کا ارادہ کر لیا۔ رات کو

[ا]...... حضرت محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فرزند تھے، مگر ان کی والدہ، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نہ تھیں۔ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ ان سے محبت کرتے تھے۔ وفات کے وقت حسنین کو اور ان کو آپس میں احترام و محبت کی وصیت فرمائی تھی (راقم الحروف کا خاندان حضرت محمد بن حنفیہ کی اولاد سے ہے)---

نانا جان ﷺ کے روضہ اطہر پر حاضر ہو کر عرض گزار ہوئے:

”دعا کیجیے کہ میں صراط مستقیم پر قائم رہوں، ایسا نہ ہو کہ عزیزوں کی محبت

اور بچوں کی مامتا میری صداقت میں حائل ہو جائے---

میرا عزم ہے کہ وقت آنے پر میں اپنے کلیجے کے ٹکڑے خدا کی راہ میں

قربان کردوں اور تیوری پر بل نہ لاؤں“---

مدینہ سے کوچ

۲۷/رجب ۶۰ھ، مطابق ۳/مئی ۶۸۰ء کو سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ رات کی خاموشی میں مکہ کی طرف روانہ ہوئے---

آپ مدینہ کو چھوڑ رہے تھے، جہاں آپ نے جنم لیا، جہاں مسجد نبوی کے سایوں میں آپ پروان چڑھے اور جہاں آپ اپنے نانا ﷺ کے کندھوں پر کھیلا کرتے تھے---

نیرنگی تقدیر ہے کہ ایک وہ وقت تھا جب کہ رسول اللہ ﷺ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ کی طرف تشریف لا رہے تھے اور آج ابن رسول رضی اللہ عنہ مدینہ سے کوچ کرتے ہوئے مکہ کی طرف جا رہے تھے---

امام حسین رضی اللہ عنہ شعب ابی طالب میں

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ [۱] مکہ پہنچ کر شعب ابی طالب میں مقیم ہوئے۔ یہ

[۱]......آپ ۳/شعبان، ۹/مئی ۶۸۰ء کو مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے---

وہی بستی تھی، جہاں سرورِ کائنات علیہ التسلیم والتحیات اس وقت مقیم رہے، جب قریش نے آپ سے بائیکاٹ کیا تھا۔ حجاز میں رسول خدا ﷺ کا نواسہ زندگی کا آخری سفر کر رہا تھا اور ادھر عراق کے عوام و خواص میں ہلچل مچی ہوئی تھی کہ ہمارا امام تشریف لا رہا ہے---[۱]

کوفیوں نے جناب کو پے در پے خطوط لکھے، جن کا مضمون یہ تھا:

''اب ہم پر کوئی امام نہیں ہے، آپ آیئے تاکہ آپ کے ذریعے اللہ تعالیٰ ہمیں حق پر جمع کر دے۔ اگرچہ نعمان (گورنر کوفہ)[۲] شاہی محل میں ہے، لیکن اس کے ساتھ نہ تو ہم شریک جمعہ ہوتے ہیں اور نہ شریک عید، اگر ہم کو یہ معلوم ہو جائے کہ آپ تشریف لائیں گے تو ہم اس کو اس طرح

---

[۱]......کوفہ میں سلیمان خزاعی کے مکان پر ایک خفیہ میٹنگ ہوئی، جس میں سردارانِ کوفہ نے کہا، ہم امام حسین رضی اللہ عنہ پر جانیں قربان کر دیں گے اور پھر آپ کو خط لکھا گیا---

[۲]......نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ صحابی تھے، کوفہ میں اموی حکومت کے گورنر تھے، جب امام مسلم رضی اللہ عنہ کوفہ پہنچے تو حضرت نعمان رضی اللہ عنہ نے ان پر کوئی سختی نہ کی۔ یہی وجہ تھی کہ ہزاروں کوفی امام مسلم رضی اللہ عنہ کے حلقہ بیعت میں داخل ہو گئے۔ حکومت کے ایک حامی نے یزید کو لکھا کہ اگر عراق کی ضرورت ہے تو کوئی انتظام کرو۔ چناں چہ یزید نے ابن زیاد کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا، یہ بڑا سخت مزاج اور ظالم تھا۔ اس کے آتے ہی کوفہ کی ساری فضا بدل گئی۔ حضرت نعمان چوں کہ صحابی تھے، دل میں اہل بیت کی قدر و محبت کا جذبہ رکھتے تھے، انہوں نے اپنی معزولی پر خدا کا شکر ادا کیا کہ اللہ نے آزمائش سے بچایا اور دمشق چلے گئے۔ آگے چل کر جب اہل بیت کا قافلہ یزید کے پاس پہنچایا گیا تو اس نے درباریوں سے پوچھا:

''ان سے کیا سلوک کیا جائے''؟---

اس وقت حضرت نعمان رضی اللہ عنہ بولے تھے:

''ان سے وہی سلوک کیجیے جو رسول اللہ ﷺ انہیں اس حال میں دیکھ کر کرتے''---

نکال دیں کہ وہ شام ہی میں جا کر دم لے گا---

ان شاء اللّٰہ و السلام علیك و رحمة اللّٰہ و برکاتہ---

[ابن خلدون، کامل ابن اثیر، جلد۴، صفحہ۱۰]

کوفہ کے معززین و عمائد نے تقریباً ڈیڑھ سو چٹھیاں لکھیں اور عام پبلک کے خطوط کا تو کوئی شمار ہی نہیں تھا---

اندازے کے لیے یہ کافی ہے کہ یکم محرم کو مقام سراف پر عراقی لشکر کے سامنے تقریر کرتے ہوئے، امام حسین رضی اللہ عنہ نے خطوط کے دو بھرے ہوئے تھیلے الٹ دیے تھے اور فرمایا تھا، یہ ہے تمہاری دعوت---[طبری]

یہ تھا کوفیوں کا مطالبہ اور ادھر مکہ کے اکابر ملت یوں کہہ رہے تھے:

عمرو بن عبدالرحمٰن

''میں نے سنا ہے کہ آپ عراق جا رہے ہیں، مجھ کو خوف ہے کہ جن لوگوں نے آپ کی مدد کا وعدہ کیا ہے، وہی آپ سے لڑیں گے''---

عبداللہ بن عباس

''ابن عم! لوگوں میں یہ خبر گرم ہے کہ تم عراق جا رہے ہو، مجھ کو یقین ہے کہ یہ سب تم کو دھوکا دے جائیں گے، تم کو جھٹلائیں گے، تمہاری مخالفت کریں گے، تمہیں بے یار و مددگار چھوڑ دیں گے اور جب تمہارے

مقابلے کے لیے بلائے جائیں گے تو تمہارے سب سے بڑے دشمن ثابت ہوں گے"---

عبداللہ بن زبیر

"ان کا مشورہ بھی یہی تھا کہ اگر آپ حجاز ہی میں رہ کر حصول خلافت کی کوشش کریں تو ہم سب بیعت کر کے آپ کی مدد کریں گے اور آپ کے خیر خواہ رہیں گے"---

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بھی آپ کے کوفہ جانے کے خلاف تھے۔ انہوں نے حضرت امام رضی اللہ عنہ کو گلے سے لگایا اور نہایت دردمندی سے اپنا مشورہ عرض کیا---

سیّدنا امام حسین رضی اللہ عنہ نے ان حضرات کی باتیں پوری توجہ کے ساتھ سنیں، تاہم آپ نے اپنا موقف تبدیل نہ فرمایا (آپ کوفہ جانے کو کیوں ضروری سمجھتے تھے، یہ وضاحت کتاب کے آخر میں ملاحظہ کیجئے) حضرت امام رضی اللہ عنہ کو کوفیوں کی طرف سے جو آخری خط وصول ہوا، اس کی عبارت یہ تھی:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِلَى الْحُسَيْنِ بْنِ عَلِيٍّ مِنْ شِيْعَةِ اَبِيْهِ عَلِيٍّ اَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ سَلَامٌ عَلَيْكَ اَمَّا بَعْدُ فَاِنَّ النَّاسَ يَنْتَظِرُوْنَكَ وَلَا رَأْيَ لَهُمْ فِيْ غَيْرِكَ الْعَجَلُ يَا ابْنَ رَسُوْلِ اللّٰهِ الْعَجَلُ---

"یہ خط حسین بن علی کے نام ہے، جو ان کے والد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شیعہ کی طرف سے لکھا جاتا ہے۔ آپ پر سلامتی ہو، صورت یہ ہے کہ لوگ

آپ کا انتظار کر رہے ہیں اور آپ کے سوا کسی اور کے متعلق (حق خلافت کی مطلقاً) کوئی رائے نہیں رکھتے۔ اے رسول اللہ کے بیٹے! اب جلدی کیجیے"---

حضرت امام رضی اللہ عنہ نے مسلم بن عقیل رضی اللہ عنہ کو کوفہ روانہ کر دیا اور کوفیوں کو یہ خط لکھ دیا:

"جو تم نے لکھا، میں سمجھ گیا، سر دست اپنے چچا زاد بھائی مسلم بن عقیل کو بھیجتا ہوں، اگر تمہارے رؤسا نے اپنی تحریر کے مطابق عمل کیا، تو میں عنقریب آ جاؤں گا اور بے شک امام وہی ہے جو کتاب اللہ پر عامل ہو، عدل اور دین ہدیٰ پر قائم ہو---والسلام"---[ابن اثیر، جلد ۴، صفحہ ۱۰]

بالآخر ۸/ ذی الحج ۶۰ ھ، بمطابق ۹/ ستمبر ۶۸۰ء کو خود خورشید آسمان اہل بیت کوفہ کی راہوں میں کرنیں بکھیرنے لگا، یعنی خاندان رسالت کا کارواں عراق کی جانب چل نکلا، جب یہ قافلہ بطن رملہ سے آگے بڑھا تو عبد اللہ بن مطیع، جو عراق سے آ رہے تھے، حضرت امام رضی اللہ عنہ کی راہ میں کھڑے ہو گئے اور پوچھنے لگے:

"آپ حرم سے باہر کیوں تشریف لے آئے ہیں؟"---

حضرت امام رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"مجھے کوفہ والوں نے اپنے ہاں بلایا ہے"---

حضرت عبد اللہ نے عرض کی:

"آپ کوفہ کا قصد نہ فرمائیے، وہاں یقیناً آپ شہید کر دیے جائیں گے"---

حضرت امام رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"اچھا جو کچھ خدا نے لکھا ہے، اس سے زیادہ تو کچھ نہیں ہو سکتا"---

یہ کاروان وادیٔ رملہ سے گزر کر مقام زرود میں ٹھہرا، یہاں زہیر بن قین کا خیمہ پہلے سے لگا ہوا تھا، وہ حج سے فارغ ہو کر کوفہ جا رہا تھا۔ یہ معلوم کر کے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے

گھرانے والے شوقِ شہادت میں سفر کر رہے ہیں۔ جناب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا، اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور سپاہی بن کر ساتھ روانہ ہو لیا، ادھر طاہرین وطیبین کا یہ گروہ صحرائے کوفہ میں بادہ پیما تھا اور اُدھر کوفہ میں ضمیر اور ایمان کے کچے لوگ غدر اور خیانت کا آغاز کر چکے تھے---[۱]

سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کے بھیجے ہوئے قاصد حضرت امام مسلم رضی اللہ عنہ بن عقیل کو

---

[۱]......امام مسلم رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کرنے والوں کی تعداد ہزاروں تک تھی، ایک دن آپ نے اپنی جمعیت کو ساتھ لے کر ابن زیاد کے محل کا محاصرہ کر لیا، ابن زیاد تند مزاج ہونے کے علاوہ بڑا سازشی اور چال باز بھی تھا، اس نے اپنے آدمی اس لشکر میں بھیج دیئے، جنہوں نے قتل و غارت کی دھمکیوں اور بھاری رشوت کے وعدوں سے کوفی سرداروں کے ارادوں کو متزلزل کر دیا اور وہ محاصرہ چھوڑ کر کھسکنے لگے۔ شام کے بعد حضرت امام مسلم رضی اللہ عنہ نے اپنے آپ کو تنہا پایا اور ایک عورت طوعہ کے گھر پناہ لی، جہاں سے آپ کو ابن زیاد کے آدمی گرفتار کر کے لے گئے، ابن زیاد نے کہا:

''تم لوگوں میں تفرقہ ڈالنے آئے ہو''---

آپ نے فرمایا:

''ہم عدل وانصاف قائم کرنے اور کتاب وسنت کی دعوت دینے آئے ہیں''---

ابن زیاد بولا:

''کہاں تم اور کہاں کتاب وسنت، میں تمہیں اس طرح قتل کروں گا کہ زمانہ اسلام میں آج تک کسی کو اس طرح قتل نہ کیا گیا ہو''---

حضرت مسلم رضی اللہ عنہ نے نہایت جرأت سے جواب دیا:

''بے شک تم اسلام میں سب سے زیادہ بدعتیں پیدا کرنے والے ہو، خباثت اور کمینگی میں تمہارا کوئی مقابل نہیں''---

ابن زیاد نے حکم دیا کہ محل کی چھت پر سے ان کی گردن اڑا دی جائے۔ اس حکم کی تعمیل ہوئی، یہ واقعہ ۹ رذی الحجہ ۶۰ ھ، مطابق ۱۰ رستمبر ۶۸۰ء کو پیش آیا---

گرفتار کر کے ابن زیاد کے سپرد کر دیا گیا، جہاں آپ بے دردی سے شہید کر دیے گئے---

انا للہ و انا الیہ راجعون

سوانح کربلا میں خون کی یہ پہلی لکیر تھی، جو کوفہ میں مسلم بن عقیل کے خون سے کھینچی گئی۔
حضرت امام رضی اللہ عنہ مقام ثعلبہ میں وارد ہوئے تو یہ پہلی دردناک خبر موصول ہوئی، یہاں بعض ساتھیوں نے ایک مرتبہ پھر واپسی کے لیے اصرار کیا لیکن مسلم رضی اللہ عنہ مظلوم کے بھائی پکار اٹھے:

''خدا کی قسم! جب تک ہم بھائی کا بدلہ نہ لے لیں گے یا خود بھی شہید ہو جائیں گے، واپس نہیں لوٹیں گے''---

آگے چل کر ایک مقام پر مسافر صحرائے عشق نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

''دیکھو ہمارے قاصد کو قتل کیا جا چکا ہے، ہمارے شیعوں نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا ہے اور صورت حال بالکل دگرگوں ہو چکی ہے۔ لہٰذا میں اجازت دیتا ہوں، جو جانا چاہتا ہے، بہ خوشی چلا جائے''---

اس تقریر پر جو ادھر اُدھر سے آکر مل گئے تھے، الگ ہو گئے اور صرف مخلصین و صابرین باقی رہ گئے اور سالار کارواں نے آگے بڑھنے کا حکم فرمایا۔ زبالہ سے آگے نکلے تو وادیٔ عتبہ میں ایک شخص ملا، اس نے بڑے الحاح و اصرار کے ساتھ واپسی کا مشورہ پیش کیا، آپ نے فرمایا:

''خدا کے حکم کے خلاف نہیں کیا جا سکتا''---

جب ۶۱ھ کے محرم کا چاند طلوع ہوا تو یہ پاک کاروان، ذی حشم کے پاس مڑ کر دامن کوہ میں خیمہ زن ہوئے---

اسی میدان میں حر بن یزید تمیمی ایک لشکر کی کمان کرتا ہوا آن پہنچا---[۱]

پہلی تقریر

نماز ظہر سب نے شہزادۂ خاندانِ نبوت کے پیچھے ادا کی اور یہیں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے سفر کی پہلی تقریر فرمائی:

''لوگو! میں خود نہیں آیا، مجھے تمہارے خطوط اور قاصد لائے ہیں، تم نے کہا تھا ہمارا کوئی امام نہیں، آپ آیئے کہ آپ کے ذریعے خدا ہمیں سیدھے راستے پر لگا دے''---

نماز عصر پڑھ کر جب قافلہ کوچ کرنے والا تھا تو آپ رضی اللہ عنہ نے پھر تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

''لوگو! اگر تم خدا سے ڈرو اور حق دار کا حق پہچانو، تو یہ خدا کی رضا مندی کا موجب ہوگا''---

حر کو یہ تاکید کی گئی تھی کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو واپس نہ جانے دینا اور نہ کہیں ادھر اُدھر ہونے دینا۔ انہیں کوفہ کی حد تک پہنچا کر چھوڑنا، چناں چہ وہ برابر آپ کی نگرانی کرتا رہا۔ جب آپ مقام بیضہ پر پہنچے تو آپ نے ایک مفصل تقریر فرمائی:

---

[۱]......رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نواسے رضی اللہ عنہ نے حکم دیا:

''ان کو پانی پلاؤ اور ان کے گھوڑوں کو بھی سیراب کردو، یہ گرمی میں آرہے ہیں''---

اس حکم کی فوراً تعمیل ہوئی---

''لوگو! رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے، جس نے ظالم، محرمات الٰہی کو حلال کرنے والے، خدا کے عہد توڑنے والے، سنت رسول کے مخالف اور خدا کے بندوں پر زیادتی کے ساتھ حکومت کرنے والے بادشاہ کو دیکھا اور اس کو قولاً یا عملاً غیرت نہ آئی تو خدا کو حق ہے کہ اس کو اس بادشاہ کی جگہ دوزخ میں داخل کرے---

لوگو! خبردار ہو جاؤ، انہوں نے شیطان کی اطاعت اختیار کی ہے اور رحمٰن کی اطاعت چھوڑی ہے، ملک میں فساد پھیلایا ہے، حدود الٰہی کو معطل کر دیا ہے، خدا کے حرام کو حلال اور حلال کو حرام کر رکھا ہے، اس لیے مجھے غیرت آنے کا زیادہ حق ہے---

میں علی اور فاطمہ بنت رسول (رضی اللہ عنہما) کا بیٹا حسین ہوں، میری ذات تم لوگوں کے لیے نمونہ ہے، اگر تم عہد توڑ کر میری بیعت کا حلقہ اپنی گردن سے نکال ڈالو گے تو مجھے اپنی جان کی قسم، یہ بھی تم سے کوئی بعید نہیں۔ جو عہد شکنی کرتا ہے، وہ گویا خود اپنے کو دھوکا دیتا ہے، عنقریب خدا مجھ کو تمہاری امداد سے بے نیاز کر دے گا'' --- [ابن اثیر، جلد ۴]

حر کہنے لگا:

''اگر آپ نے جنگ کی، تو آپ قتل ہو جائیں گے'' ---

آپ نے فرمایا:

''جب اوسی نے اپنے چچازاد بھائی کو رسول خدا ﷺ سے الگ کرنے کے لیے قتل کی دھمکی سنائی تھی تو اس نے جواب میں جو شعر پڑھا تھا، میں بھی تیرے جواب میں وہی پیش [۱] کرتا ہوں:

[۱]......اس کے ساتھ کے دوسرے اشعار مع ترجمہ پیچھے آ چکے ہیں---

سَأَمْضِیْ وَ مَا بِالْمَوْتِ عَارٌ عَلَی الْفَتٰی
إِذَا مَا نَوٰی خَیْرًا وَ جَاھَدَ مُسْلِمًا

"میں یوں ہی بڑھتا چلا جاؤں گا کیوں کہ ایک جوان مرد کے لیے
موت کوئی طعنہ نہیں جب اس کے ارادے نیک ہوں اور وہ سچا مسلمان مجاہد ہو"---

بیضہ سے چل کر عذب الھجانات پہنچے اور وہاں سے قصر بنی مقاتل میں تشریف لائے، جو راستے کی آخری منزل تھی اور اب اپنے وقت کا مقدس ترین قافلہ، جس کی سارے عالم میں نظیر نہ تھی، جس کی ہودج نشین زہراء جنت کی بیٹیاں تھیں، جس کا سالار کارواں شہ سوار دوش مصطفیٰ (ﷺ) تھا، جس کے عمامے کو آسمان کے ستارے نگاہوں سے چوم رہے تھے اور جس کے قدموں کو صحراء کے ذرے بوسے دے رہے تھے۔ اپنے سفر کو ختم کر کے ۲ رمحرم الحرام ۶۱ ھ، بمطابق ۲/۱ اکتوبر ۶۸۰ء نینوا کے میدان کرب وبلا میں اقامت گزیں ہوا، جہاں موت کو ہمیشہ کی شکست اور زندگی کو ہمیشہ کی فتح نصیب ہونے والی تھی:

اس میں ہزئی ہیں موت کو پیہم ہزیمتیں
کرب و بلا کی خاک ہے میدان زندگی

دس محرم تک

فرات کے کناروں پر رسول اللہ ﷺ کے گھر والے خیمہ زن ہو چکے تھے---
ادھر کوفہ کے گورنر ہاؤس میں ان کے استیصال کے لیے سکیمیں بنائی جا رہی تھیں---
عمرو بن سعد، ری کی حکومت کے لالچ میں تاریخ کے اس سنگین ترین جرم کے لیے آمادہ ہو گیا---

۲ر محرم الحرام کو بنو ہاشم کا غریب الوطن قافلہ پہنچا تھا اور اگلے دن ۳ر محرم کو ابن سعد کوفی اور شامی افواج کی کمان کرتا ہوا، کربلا میں کربلا بپا کرنے کے لیے آ گیا---

ابن زیاد کا آرڈر

فرات کے کنارے پر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کا جائزہ لے کر نیز ان کے خیالات معلوم کر کے ابن سعد نے ابن زیاد کو خط لکھا۔ اس خط کے جواب میں ابن زیاد نے لکھا[۱]:

''نہیں نہیں، کوئی صورت نہیں، مگر یہ ہمارے ہاتھ میں ہاتھ دے دیں''۔۔۔

[تہذیب التہذیب، صفحہ ۳۵۲]

اس کے ساتھ ہی کوفہ کی طرف سے دوسرا حکم یہ موصول ہوا کہ قافلے والوں پر پانی بند کر دو اور بیعت کا مطالبہ جاری رکھو۔۔۔

چناں چہ پانچ سو سواروں کی ایک جماعت فرات کی موجوں کی نگرانی کرنے لگی۔

[۱]......ابن سعد اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے درمیان کئی گفتگوئیں ہوئیں، خلاصہ یہ تھا کہ حضرت امام رضی اللہ عنہ کی طرف سے تین چیزیں پیش کی گئیں:

① مجھے سرحدوں پہ جانے دو۔۔۔

② یزید کے پاس پہنچنے دو کہ براہ راست اس سے گفتگو کروں۔۔۔

③ مجھے حجاز واپس جانے دو۔۔۔

ابن سعد نے خوش ہو کر ابن زیاد کو خط لکھا، ابن زیاد بھی پہلے یہ تجاویز منظور کرنے پر آمادہ نظر آیا مگر شمر نے یہ کہہ کر کہ ''حسین پھر قابو نہیں آئیں گے'' اس رائے کو بدل دیا اور اس نے ابن سعد کو لکھا:

''میں نے تمہیں حسین کی طرف سے سفارشیں کرنے کے لیے نہیں بھیجا، انہیں ہتھیار ڈالنے کا حکم دو، نہیں تو انہیں قتل کر دو''۔۔۔

[ابن اثیر، جلد ۴، صفحہ ۲۸]

آپ نے ابن سعد کو پیغام بھیجا کہ میں تم سے تنہائی میں ملنا چاہتا ہوں، اس نے منظور کرلیا۔ چنانچہ رات کے وقت دونوں بیس بیس سپاہیوں کا دستہ لے کر خیموں کے درمیان ایک دوسرے سے ملے۔ کافی دیر تک بات چیت ہوتی رہی، اس اہم گفتگو کا مضمون کہیں نہیں ملتا، صرف قیاس آرائیاں ہیں۔ بہر کیف اتنا تو ظاہر ہے کہ اس گفتگو کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا، کیوں کہ کشیدگی بدستور باقی رہی، فوجی پہرہ اور پانی کی بندش میں کوئی فرق نہ آیا---

ایک غلط فہمی کا ازالہ

بعض کہتے ہیں کہ امام حسین رضی اللہ عنہ نے کہہ دیا تھا کہ میں یزید کے ہاتھ میں ہاتھ دینے پر رضامند ہوں۔ لیکن حافظ ذہبی اور علامہ ابن حجر اس روایت کو تسلیم نہیں کرتے۔ عقبہ بن سمعان کہتے ہیں:

> "میں مدینہ سے مکہ اور مکہ سے عراق تک برابر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہا اور شہادت تک ان سے جدا نہ ہوا مگر آپ نے مدینہ میں، مکہ میں، عراق میں، لشکرگاہ میں، غرض تادم شہادت کہیں بھی یہ نہیں کہا کہ مجھے یزید کے ہاتھ میں ہاتھ دینے دو"---

خیر یہ کوئی ایسی روایت تو ہے نہیں کہ اس کے ازالے میں کچھ مزید کہنے کی ضرورت ہو، ہمارے نزدیک تو سانحہ کربلا کا سارا فلسفہ ہی یہ ہے کہ:

چڑھ جائے کٹ کے سر ترا نیزے کی نوک پر
لیکن یزیدیوں کی اطاعت نہ کر قبول

ابن زیاد کا آخری آرڈر

ابن زیاد کا جو تیسرا جابرانہ آرڈر آیا، وہ یہ تھا:

''میں نے تمہیں اِس لیے نہیں بھیجا کہ تم ڈھیل دیتے رہو، دن بڑھاتے چلے جاؤ اور حسین کے وکیل بن کر ان کی سلامتی چاہو۔ تم حسین اور ان کے ساتھیوں کو میرا حکم ماننے کے لیے کہو، مان جائیں تو ہمارے پاس بھیج دو، نہیں تو فوراً حملہ کر دو۔ یہ سرکش اور جھگڑالو ہیں---

اگر یہ کام تم سے نہ ہو سکے تو فوج شمر ذی الجوشن کے حوالے کر دو، وہ خود میرے آرڈر کی تعمیل کرے گا''---[کامل ابن اثیر، صفحہ ۲۸]

ابن زیاد کے اس آخری حکم نے کش مکش کربلا کو جنگ میں تبدیل کر دینے کا کام کیا۔ ابن سعد، والیٔ کوفہ کے تیور بھانپ گیا اور وہ ہاشمی مسافروں کے خلاف آخری قدم اٹھانے کے لیے آمادہ ہو گیا---کوفی افواج میں حرکت پیدا ہوئی تو شمر اہل بیت کے خیموں کے پاس جا کر حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور ان کے بھائیوں کو کہنے لگا:

''چوں کہ میں تمہارا ماموں ہوں، لہٰذا از راہ قرابت میں تمہیں امان دیتا ہوں''---

انہوں نے جواب دیا:

''تجھ پر اور تیری امان پر ہم پھٹکار بھیجتے ہیں، اگر تجھے حق قرابت ملحوظ ہوتا تو ہمیں امان دیتا اور ابن رسول کو نہ دیتا؟''---

[ابن اثیر، جلد ۴، صفحہ ۴۷]

جنگ کی وارننگ

عصر کے بعد ابن سعد ایک دستے کی ہمراہی میں مدنی خیمہ گاہ کے پاس جنگ کی وارننگ دینے کے لیے آیا، سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ باہر تشریف نہ لائے، صرف یہ کہلا بھیجا کہ آج کی رات گزر جانے دو، صبح دیکھا جائے گا۔ ابن سعد واپس چلا گیا---

دسویں رات

یہ ۹ محرم الحرام کا دن تھا، جب رات کی تاریکی چھانے لگی تو حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے گھرانے کے تمام افراد اور رفقاء کو جمع فرما لیا اور انہیں آخری مرتبہ مشورہ دیا:

"میں تم لوگوں کو خوشی سے اجازت دیتا ہوں، میری طرف سے کوئی ملامت نہ ہوگی۔ رات ہو چکی ہے، ایک ایک اونٹ لے لو، خدا تم سب کو جزائے خیر دے، تم لوگ اپنے اپنے شہروں اور دیہاتوں میں چلے جاؤ، یہاں تک کہ خدا یہ مصیبت آسان کر دے---

یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ (یہ) لوگ مجھی کو ڈھونڈیں گے، میرے بعد کسی کی تلاش نہ ہوگی"---

ساتھیوں کے ولولے

عقیل کے بیٹوں نے عرض کی:

''خدا کی قسم! ہم ہرگز ایسا نہیں کرسکتے، ہم لوگ جان، مال اور اہل وعیال سب کچھ آپ پر قربان کردیں گے۔ جو انجام آپ کا ہوگا، وہی ہمارا ہوگا۔ آپ کے بعد جینا بے کار ہے''---

مسلم بن عوسجہ اسدی نے عرض کی:

''خدا کی قسم! اگر میرے پاس کوئی ہتھیار بھی نہ ہوتا تو دشمن سے پتھر مار کر لڑتا، یہاں تک کہ آپ پر فدا ہو جاتا''---

سعد بن عبداللہ حنفی نے عرض کی:

''اگر مجھ کو یہ یقین ہوتا کہ میں ستر مرتبہ قتل کیا جاؤں گا اور ہر مرتبہ آگ میں جلا کر میری راکھ اڑادی جائے گی تو بھی آپ کا ساتھ نہ چھوڑتا''---

زہیر بن قین یوں عرض گزار ہوئے:

''خدا کی قسم! مجھے تمنا ہے، میں قتل ہوتا، پھر زندہ کیا جاتا، پھر قتل ہوتا۔ اس طرح ہزاروں دفعہ زندہ ہو ہو کر قتل کردیا جاتا لیکن کاش خدا آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو بچالیتا''---[ابن اثیر، جلد۴]

مختصر یہ کہ سالار کاروان کو یقین ہوگیا کہ ان میں سے کوئی بھی جان بچا کر جانا نہیں چاہتا، سب میری طرح چراغ حق کی ضوء پر نثار ہونے کا بے پناہ ولولہ رکھتے ہیں:

تنہا [۱] تمہیں نہیں ہو محبت میں خستہ حال
اس راستے میں اور بھی آشفتہ سر ملے

امام عالی مقام رضی اللہ عنہ نے اپنی تلوار کو صاف کرنا شروع کیا اور منہ سے کوئی مؤثر شعر [۲] گنگنانے لگے۔ جس پر امام کی غم گسار بہن سیدہ زینب بنت فاطمہ رضی اللہ عنہما سے نہ رہا گیا

[۱]...... یہ شعر عارف تخلص کے کسی شاعر کا ہے، میں نے عارف کی جگہ ''تنہا'' کردیا ہے---
[۲]...... وہ اشعار مع ترجمہ پچھلے صفحات میں گزر چکے ہیں---

اور باچشم تر فرمایا---

خیمہ میں بہن اور بھائی کا مکالمہ

''کاش آج موت میری زندگی کا خاتمہ کر دیتی، آج میری ماں فاطمہ رضی اللہ عنہا، میرے باپ علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور میرے بھائی حسن رضی اللہ عنہ میں سے کوئی بھی موجود نہیں۔ بھیا! ان گزرے ہوؤں کے جانشین اور ہم لوگوں کے سہارا تم ہی ہو''---

حضرت امام: بہن! حلم و وقار کا ساتھ نہ چھوڑو---

حضرت زینب: بھائی! میں آپ پر قربان، میں آپ کے بدلے میں اپنی جان دینا چاہتی ہوں---

حضرت امام: (پرنم ہو کر) بہن ذرا چین سے رہنے دو---

حضرت زینب: (آنکھوں سے آنسو برساتے ہوئے) ''آپ کا مجھ کو الگ کرنا، میرے دل کے ٹکڑے اڑائے دے رہا ہے''---

پھر آپ شدت گریہ سے بے ہوش ہو گئیں۔ غم زدہ بھائی نے بے ہوش بہن کے چہرے پر نظریں جما دیں، جب انہیں کچھ ہوش آیا تو آپ نے تلقین فرمائی---

بہن کو وصیت

''بہن! خدا سے تسکین حاصل کرو، ایک نہ ایک دن تمام روئے زمین

کے باشندے مر جائیں گے، آسمان و زمین میں کوئی بھی باقی نہ رہے گا، ایک خدا کی ذات باقی رہے گی.......... ہر مسلمان کے لیے رسول اللہ ﷺ کی ذات نمونہ ہے، تم اسی نمونہ سے صبر و تسلی حاصل کرو---

بہن! میں تم کو قسم دلاتا ہوں کہ میں شہید ہو جاؤں تو اسوۂ رسول ﷺ کے خلاف نہ کرنا، میری موت پر گریبان نہ پھاڑنا، منہ نہ نوچنا اور بین نہ کرنا"---

[ابن اثیر، جلد ۴، صفحہ ۵]

رات کا ایک حصہ گزر چکا تھا، کربلا کے شہزادے نے سب کو تسکین و تسلی کی تھپکیاں دے کر سلا دیا اور خود زندگی کی اس آخری رات میں اپنے رب ذوالجلال سے یوں باتیں شروع کیں:

"خدایا! نتیجہ مجھ کو معلوم ہے مگر میرے ساتھی میرے اصرار پر بھی میرا ساتھ نہیں چھوڑتے۔ میری بہن، بھائی اور بچے سب تجھ پر قربان ہوں---

احکم الحاکمین! میری ناچیز قربانی قبول فرما، بچوں کی محبت میرے مقصد ایثار میں حائل نہ ہو۔ میرے حوصلے بلند فرما، دشمن کے سامنے جری بن کر گلا کٹواؤں، عزیزوں کے جنازے اٹھاؤں مگر زبان پر صبر و شکر کے سوا کچھ نہ لاؤں"---

کسے معلوم ہے کہ امام مطہر، سید اطہر، پسر رسول، پارۂ قلب بتول نے حیات ظاہری کی اس آخری شب میں کس کیفیت کی عبادت کی ہوگی، اپنے اللہ کو کس طرح یاد کیا ہوگا؟---

صرف ایک روایت ملتی ہے، جو ان کی رات کے ماحول کی ایک جھلک دکھاتی ہے---

جعفر بن سلیمان کہتا ہے:

"میں محرم کی دسویں رات کو کربلا کے میدان میں آل حیدر کے خیموں کی

بستی میں گیا، درمیانی خیمے سے روشنی کی مدھم شعاعیں آ رہی تھیں، میں نے جھانک کر دیکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ امام سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے سامنے قرآن کریم کھلا ہوا ہے، آپ سوز سے تلاوت کر رہے ہیں اور آنسو برسا رہے ہیں"---[تہذیب التہذیب]

دل میں ہو یاد تری گوشۂ تنہائی ہو
پھر تو خلوت میں عجب انجمن آرائی ہو

آخری صبح

رات گزری اور امام حسین رضی اللہ عنہ کے لیے دنیا کی آخری صبح طلوع ہوئی، میدان میں ایک طرف بہتّر (۷۲) مسافر تھے اور دوسری جانب ہزاروں کی تعداد میں مسلح فوجیں تھیں---

آپ نے خدا کی کتاب سامنے رکھ کر ایک مرتبہ پھر صبر وسکون اور تسکین وثبات کے لیے اللہ کریم سے دعا مانگی، پھر میدان میں آ کر کوفی عساکر کی قطاروں کے سامنے زندگی کی آخری تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"لوگو! میرے نسب پر غور کرو، کیا میں تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیٹی رضی اللہ عنہا کا لڑکا نہیں ہوں، کیا تمہیں فرمان رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یاد نہیں کہ ہم جوانان جنت کے سردار ہیں؟---

جاؤ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے پوچھ لو، ابوسعید خدری، زید بن ارقم اور انس بن مالک رضی اللہ عنہم سے پوچھ لو"---

قیس بن اشعث بولا:

تم اپنے بنی عم کا کہنا کیوں نہیں مان لیتے؟---

آپ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا:

''خدا کی قسم! میں ذلیلوں کی طرح اس کے ہاتھ میں ہاتھ نہیں دوں گا اور غلاموں کی طرح اس کا اقرار نہیں کروں گا''---

اسی اثنا میں افواج کوفیہ متحرک ہو رہی تھیں، ابن سعد آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک حضرت حر رضی اللہ عنہ مدنی قافلے کی طرف آ گئے اور مسلمانوں کے آقا رضی اللہ عنہ کی طرف سے ایک تقریر کی---[ا]

اس کے جواب میں ابن سعد نے پہلا تیر چلا کر جنگ کربلا کا آغاز کر دیا---

تھوڑی دیر تک فرداً فرداً لڑائی ہوتی رہی، حجازیوں کا ایک ایک آدمی مقابلہ کرتا ہوا شہید ہو رہا تھا مگر دشمن کا کافی نقصان ہوتا جا رہا تھا---

---

[ا]......حر کا دل شروع ہی سے دھڑک رہا تھا، آج وہ دونوں خیمہ گاہوں کے درمیان کھڑے کچھ سوچ رہے تھے۔ ایک کوفی سپاہی نے کہا:

''حر! تم جیسا بہادر اور یہ حالت' کیا سوچ رہے ہو''---

حضرت حر نے کہا:

میں جنت اور دوزخ کے درمیان کھڑا ہوں اور سوچتا ہوں کہ کدھر جاؤں؟---

پھر فرمایا:

''لو میں نے جنت اختیار کر لی''---

یہ کہا اور سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور عرض کی:

اگر میں آپ پر قربان ہو جاؤں تو کیا پہلی لغزشیں معاف ہو جائیں گی؟---

جناب نے فرمایا:

''ہاں، تم دنیا و آخرت میں حر (آزاد) ہو''---

بالآخر عراقی کمانڈروں نے ایک دم پیش قدمی کا حکم دیا اور غربت کدۂ اہل بیت پر تیروں کا مینہ برسا دیا---

علی اکبر رضی اللہ عنہ

جب زہیر بن قیس، مسلم بن عوسجہ اور حضرت حر، نیز دیگر رفقاء اپنے محبوب آقا پر جانیں فدا کر چکے تو خاندان نبوت کے جوانوں کی باری آئی۔ سب سے پہلے سیدنا علی اکبر رضی اللہ عنہ تشریف لائے، آپ بہادروں کی طرح خراماں خراماں بڑھے، زبان پر یہ شعر تھا:

اَنَــا عَـلِــیُّ بْـنُ حُسَیْـنِ بْـنِ عَـلِـیْ
وَ رَبِّ الْبَیْتِ نَحْنُ اَوْلٰـــی بِـالنَّبِیْ

''میں حسین بن علی کا بیٹا علی ہوں، بخدا ہم لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سب سے زیادہ قریبی ہیں''---

اس کم سن شہزادے پر مرہ بن منقذ تمیمی نے نیزے کا وار کیا، آپ گرے اور فوج نے جسم کے ٹکڑے کر دیے---

بیٹا شہید ہو گیا اور صابر باپ نے لاش اٹھا کر اپنے خیمہ کے قریب لا کر رکھ دی اور دلِ پُر فگار پر مرہمِ صبر و قرار رکھتے ہوئے پڑھا:

انا للہ و انا الیہ راجعون---

بعد ازاں عبداللہ بن مسلم، عدی بن جعفر، عبدالرحمٰن بن عقیل، محمد بن عقیل، قاسم بن حسن اور ابوبکر بن حسن رضی اللہ عنہم ساغرِ شہادت نوش فرماتے گئے۔ آخر میں

حضرت عباس رضی اللہ عنہ ظہور فرما ہوئے اور وہ بھی راہ خدا میں اپنی جان قربان کر گئے۔

اب شہزادۂ بیمار سیدنا زین العابدین رضی اللہ عنہ تھے یا شہزادۂ سرور کونین سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ تھے۔ ان کے علاوہ بستانِ رسالت کی ساری کلیاں مسلی جا چکی تھیں---

کتنا استقلال، کتنا حوصلہ اور کتنا صبر و ثبات تھا، سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ میں۔ بھائی، بھتیجے اور بیٹے خون کی چادریں اوڑھ کر سو چکے ہیں۔ جن عزیزوں کے دم سے زندگی کی بہاریں قائم تھیں، اب ان کی لاشوں کے ٹکڑے چاروں طرف بکھرے پڑے ہیں۔ سب سہارے ٹوٹ چکے ہیں اور ساری امیدیں ختم ہو چکی ہیں، لیکن آپ ہیں کہ بدستور حلم و وقار کا کوہ گراں ہیں، ماتھے پر شکن نہیں، زبان پر اُف نہیں، آواز میں ضعف نہیں، عقابی نگاہوں کی تیزی میں فرق نہیں اور پائے ثبات کو ذرا بھی لغزش نہیں ہے۔ خیمے میں آتے ہیں، ہتھیار لگاتے ہیں، سواری پر قدم رکھتے ہیں اور غمیدہ خواتین کو صبر و رضا کا نمونہ بن جانے کی تلقین کرتے ہوئے، انہیں الوداع کہتے ہوئے اور آخری سلام قبول کرتے ہوئے خیمے سے باہر تشریف لاتے ہیں۔ پھر جب فرزند مصطفیٰ رضی اللہ عنہ نے میدان کا رخ کیا تو کربلا کے ذرّے اور لالہ زار جنگ کی فضائیں تکبیر و مرحبا سے معمور ہو گئیں:

نکلے حسین تیغ بہ کف خیمہ گاہ سے
گونجی صدائے مرحبا پیکار گاہ سے

آپ نے ان سنگ دل مجرموں کو آخری بار قرابتِ رسول اور اپنی عزت و حشمت یاد دلائی:

کہنے لگے حسین ہوں، ابنِ رسول ہوں
سردار اہل خلد ہوں، جنت کا پھول ہوں

بعدازاں آپ نے اپنی سواری کوعسا کر شام کی طرف موڑ دیا، کتنا عدیم النظیر یہ منظر تھا کہ عراق کے سارے سورما ایک طرف اور مدینہ کا ایک مجاہد ایک طرف۔ کوفہ کی مسلح افواج ایک طرف اور حجاز کا تنہا پردیسی ایک طرف۔ تازہ دم، خوش وخرم، اچھلتے کودتے ہٹیلے ایک طرف اور شکستہ دل، تفتہ جاں، خستہ تن، غم زدہ اور غم خوردہ جوان ایک طرف---

لیکن پھر بھی پورِرسول تھے، قاتلِ مرحب وعبدود کے بیٹے تھے، فاتحِ خیبر شکن کے فرزند تھے، رگوں میں اسد اللہ الغالب رضی اللہ عنہ کا خون تھا، رونگٹے رونگٹے میں حمیت و شجاعت کی گرمی بھری تھی، کارزارِ خونچکاں میں آئے توشیروں کی طرح گونجتے آئے، مجاہدانہ لے میں جنگی ترانہ گاتے ہوئے آئے:

أَنَا ابْنُ عَلِيِّ الْخَيْرِ مِنْ آلِ هَاشِمٍ
كَفَانِيْ بِهٰذَا مَفْخَرًا حِيْنَ أَفْخَرُ
وَجَدِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ أَكْرَمُ مَنْ مَشٰي
وَنَحْنُ سِرَاجُ اللّٰهِ فِي النَّاسِ أَزْهَرُ
وَفَاطِمَةُ أُمِّيْ سُلَالَةُ أَحْمَدٍ
وَعَمِّيْ يُدْعٰى ذَا الْجَنَاحَيْنِ جَعْفَرُ
وَفِيْنَا كِتَابُ اللّٰهِ أُنْزِلَ صَادِقًا
وَفِيْنَا الْهُدٰى وَالْوَحْيُ وَالْخَيْرُ يُذْكَرُ

''میں اس علی (رضی اللہ عنہ) کا فرزند ہوں جو بہترین بنو ہاشم تھے، نسبی فخر کے وقت یہی بات میرے لیے کافی باعث افتخار ہے---

میرے نانا رسول خدا ﷺ تھے، جو ساری خلق سے افضل ہیں اور ہم لوگ انسانیت کے لیے اللہ تعالیٰ کا روشن چراغ ہیں---

میری والدہ، وہ فاطمہ رضی اللہ عنہا ہیں، جو رسول اللہ ﷺ کا جگر پارہ تھیں اور میرے چچا حضرت جعفر طیار ذوالجناحین رضی اللہ عنہ ہیں---

ہم ہی میں اللہ کی سچی کتاب نازل ہوئی اور ہمارے گھرانے میں ہدایت، وحی اور نیکی کا چرچا رہتا ہے"---

آپ رضی اللہ عنہ نے حملہ کیا، صفیں درہم برہم ہوگئیں، کوئی آگے آنے کی جرأت نہ کرتا تھا، شدت قتال سے آپ پر تشنگی غالب آنے لگی، پہرے کی قطاروں کو چیرتے ہوئے فرات کے لب پر جا پہنچے، پانی کا بھرا ہوا چلو منہ کے قریب تھا کہ حصین بن نمیر نے دندان مبارک پر کھینچ کر تیر مارا، دہن اطہر سے خون کا فوارہ چھوٹا اور پانی کا چلو، خون کے چلو میں تبدیل ہوگیا، آپ نے آسمان کی طرف اچھال دیا:

یہ حوصلۂ اہلِ رضا تو بھی دیکھ لے
او بے نیازِ خون وفا تو بھی دیکھ لے

اب جسم میں تب و تاب ختم ہو رہی تھی، دشمن محاصرہ کیے تھا، اسی دوران میں آپ رضی اللہ عنہ کی گود میں ایک بچہ دیا گیا کہ دنیا سے رخصت ہونے والے باپ کے سایہ عاطفت کی آخری بہار لے لے۔ مگر ظلم کے ایک تیر نے، اس ننھی ہستی کو آغوش حسین میں ہی سلا دیا---

میدان جنگ میں شمر نے فوجیوں کو للکارا:

"تم سے حسین قتل نہیں ہوتا؟ دیکھتے کیا ہو، بڑھ کر حملہ کرو"---

یہ سنتے ہی نرغہ تنگ کر دیا گیا، ایک تیر آپ کی گردن میں پیوست ہو گیا، آپ اسے نکال رہے تھے کہ زرعہ بن شریک نے تلوار کے متواتر وار کیے، جس سے بدن زلزلانے لگا، عین اسی کیفیت میں سنان کے نیزے نے آپ کو بالکل نڈھال کر دیا اور زمین پر تشریف لے آئے--- پھر اسی سنان [ا] بن انس نخعی نے تاج ورِ امامت کا سر مقدس، بدن مطہر سے جدا کر دیا--- انا للّٰہ و انا الیہ راجعون

اس طرح دس محرم الحرام ۶۱ ھ، مطابق ۱۰ را اکتوبر ۶۸۰ء کو خاندان نبوت کے خون کی سرخی، عروس حق وصداقت کے عذار تاباں کا غازہ بن گئی۔ عشق ومحبت اور صبر ورضا کی داستان عنوان کربلا پر تکمیل پا گئی اور ایمان وایقان کی بلندیوں پر امام حسین رضی اللہ عنہ کے نام کا پرچم ہمیشہ کے لیے لہرا دیا گیا:

تار ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز
زندہ از تکبیر او ایماں ہنوز
در نوائے زندگی سوز از حسین
اہل حق حریت آموز از حسین

کوفیوں کی آخری ذلیلانہ حرکت یہ تھی کہ خیموں میں گھس گئے، سامان لوٹ لیا، آگ لگا دی اور لاشوں پر گھوڑے دوڑا کر، وحشت وویرانی کا پورا سماں باندھ دیا، اس طرح ۲ محرم الحرام کو ریگ کربلا پر اترنے والا فاطمی کارواں، آج دس محرم الحرام کو اپنے کوفی میزبانوں کے ہاتھوں بالکل اجاڑا جا چکا تھا۔ سلیمان بن قتبہ عدوی کہتا ہے:

مَرَرْتُ عَلٰی اَبْیَاتِ آلِ مُحَمَّدٍ
فَلَمْ اَرَهَا اَمْثَالَهَا یَوْمَ حَلَّتِ

[ا]...... بعض نے لکھا ہے کہ سر مبارک شمر نے الگ کیا تھا---

وَ کَانُوْا غِیَاثًا ثُمَّ اَضْحَوْا رَزِیَّۃً
اَلَا عَظُمَتْ تِلْکَ الرَّزَایَا وَ جَلَّتِ

[الحماسہ]

"میں اولادِ رسول ﷺ کے خیموں کے پاس سے گزرا تو مجھے وہ رونق نظر نہ آئی، جوان کے تشریف لانے کے دن تھی---
یہ تو لوگوں کے حامی و ناصر تھے اور اب خود مظلوم بن کر رہ گئے، ہائے یہ کتنے عظیم مصائب ہیں"---

ریگ کربلا سے تخت دمشق تک

خاندان نبوی کے ان صابر کاروانیوں کو راہ ایثار و رضا کی ابھی کچھ اور منزلیں طے کرنا تھیں کہ "ابھی عشق کے امتحان اور بھی تھے" کوفہ سے آرڈر آیا کہ جو کاروانی تلوار سے بچ گئے ہیں، انہیں یہاں گورنمنٹ ہاؤس میں حاضر کیا جائے---

چناں چہ ابن سعد کے سپاہی، فاطمی خواتین، بچیوں اور عابد بیمار کو ساتھ لے کر کوفہ کی طرف روانہ ہوئے، بیبیوں نے راستے میں اپنے شہداء کی لاشیں، زمین پہ یوں ہی کھلی دیکھیں، آنسو نکلے، دل دکھا، قافلے والے تو یہاں رک کر ہدیہ دل پیش کرنا چاہتے تھے:

تھم ذرا بے تابیٔ دل ٹھہر جانے دے مجھے
اور اس بستی پہ چار آنسو بہانے دے مجھے

لیکن مجبوری تھی۔ کارواں یوں ہی گزرتا چلا گیا، حتیٰ کہ یہ لوگ قصر دارالامارت میں لا کر والیٔ عراق ابن زیاد کی کرسی کے سامنے کھڑے کر دیے گئے---

لب مبارک پر چھڑی ماری گئی

سرور کونین ﷺ کے نواسے کا سر طشت میں رکھا ہوا تھا، جب مخمورِ نشۂ حکومت، ابن زیاد نے سید الشہداء رضی اللہ عنہ کے دندان مبارکہ پر چھڑی ماری تو ایک بوڑھے صحابی حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ برداشت نہ کر سکے، آپ نے فرمایا:

"مجھے اللہ کی قسم، میں نے رسول اللہ ﷺ کو ان لبوں کو چومتے ہوئے دیکھا ہے"--- (حضرت زید رضی اللہ عنہ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے)

ابن زیاد نے کہا:

"خدا تجھے ہمیشہ رلائے، اگر تو بڈھا پھوس نہ ہوتا تو میں تیری گردن اڑا دیتا"---

جب ابن زیاد کی نگاہ حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ پر پڑی، تو اس نے ان کے قتل کا حکم بھی دے دیا، لیکن حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی شدید دل بستگی نے اس کا ارادہ بدل کر چھوڑا۔ ابن زیاد نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے کہا تھا:

"دیکھا! خدا نے تمہارے اہل بیت کے ساتھ کیسا سلوک کیا؟"---

حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے جواب دیا:

"بے شک ان کی شہادت مقدر ہو چکی تھی، سو وہ مقتل میں تشریف لائے، لیکن عنقریب کل داورِ محشر کے حضور وہ تم سے انصاف طلب کریں گے"---

کوفہ کے بعد دمشق کا راستہ اختیار کیا گیا، کاروان حسب دستور سفر طے کر رہا تھا کہ ایک شخص زحر بن قیس نامی بڑی تیز رفتاری کے ساتھ دمشق میں جا پہنچا، جب اس نے کربلا کے دردناک حوادث فخریہ انداز میں پیش کیے تو اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ یزید نے اسے کوئی صلہ نہ دیا، بلکہ کہا:

"ابن زیاد پر خدا کی لعنت ہو، اگر میں ہوتا تو حسین کو معاف کر دیتا"---

(کیا یزید کا نظریہ واقعی یہی تھا یا اس کی یہ بات وقتی پالیسی کے ماتحت تھی؟ اس میں مؤرخین مختلف ہیں)

تاریخیں لکھتی ہیں کہ یزید نے پس ماندگان اہل بیت کے ساتھ نرمی اور محبت کا برتاؤ کیا، حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کو لگاتار اپنے ساتھ شاہی دسترخوان پر کھانا کھلاتا رہا، یزید نے چند روز کے بعد ان حضرات کو اپنی راجدھانی سے رخصت کر دیا، فوج کا ایک دستہ ساتھ روانہ کیا، جو ان لٹے ہوئے اور ستائے ہوئے کاروانیوں کو مدینہ طیبہ تک پہنچا آیا، یہ وہی مدینۃ الرسول تھا، جہاں سے اس سفر عشق کی ابتدا ہوئی تھی اور آج جب کہ محبت و عشق کی بازی جیتی جا چکی تھی، اس مہم کی انتہا بھی اسی مدینۃ الرسول پہ ہو رہی تھی:

مرد مومن را محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابتدا ست
مرد مومن را محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انتہا است

جب یہ قافلہ مدینہ کی گلیوں سے گزرا ہوگا تو گلیوں کے ذرّوں نے اور فضا کی موجوں نے پوچھا ہوگا، قافلے والو! ابن رسول کہاں ہیں، جنت کے پھول کہاں ہیں اور پارۂ قلب بتول کہاں ہیں؟---

جب یزید کا ملازم، اہلِ بیت کے قافلے کو مدینہ چھوڑ کر واپس جانے لگا تو حضرت زینب اور دوسری بیبیوں رضی اللہ عنہن نے اپنے باقی ماندہ زیور اتار کر اسے دینے چاہے، اور فرمایا:

یہ تمہارے اس احسان کا صلہ ہے کہ تم نے ہمیں بہ حفاظت یہاں پہنچا دیا---

مگر قاصد نے لینے سے انکار کر دیا---

کربلا کا انتقام

نہ یزید کا وہ ستم رہا نہ زیاد کی وہ جفا رہی
جو رہا تو نام حسین کا جسے زندہ رکھتی ہے کربلا

جو لوگ کربلا میں حجازی مسافروں پر ظلم و ستم ڈھاتے رہے، تاریخ بتلاتی ہے کہ ان میں سے کوئی بھی قدرت کی گرفت سے نہ بچ سکا، ہر ایک مجرم نہایت قلیل عرصے میں بدترین قسم کی ذلت و خواری میں مبتلا ہو کر اپنے کیفر کردار کو پہنچا، جو نشہ حکومت میں مخمور ہو کر اپنے قصر اقتدار کو ناقابل تسخیر سمجھتے تھے، ان پہ خدا کی لاٹھی یوں برسی کہ ان کی لاشوں پر ایک آنسو نہ بہایا گیا:

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ---

یزید

صرف ساڑھے تین سال کی حکومت کے بعد یزید کو موت کے پنجے نے آدبوچا،

موت کے وقت وہ اپنے شکار کے قلعہ میں مقیم تھا، اس کا زمانہ دینی خدمات اور اسلامی فتوحات سے خالی رہا، بلکہ وہ اپنے لیے اور اپنے خاندان کے لیے بہت برا نام حاصل کر کے بہ ہزار حسرت و حرماں دنیا سے رخصت ہوا۔ یزید کے بعد اس کے بیٹے نے تخت حکومت پر بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا:

”تم مجھے خلیفہ منتخب کرتے ہو، مگر میں اس کا اہل نہیں اور آج اس امت میں کوئی عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی نظر نہیں آتا، جس کے سپرد یہ کام کیا جاسکے“---

یہ کہہ کر وہ گوشہ نشین ہو گیا اور تین ماہ کے بعد راہی ملک عدم ہوا۔ اس کے بعد مروان بن حکم کو صاحب تخت بنا دیا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سانحہ کربلا کے بعد تین سال میں یزید اور اس کی اولاد سلطنت سے محروم ہو کر رہ گئی---

مختار ثقفی

مختار کا باپ عبیدہ ثقفی، عہد فاروقی میں کوفہ و عراق کا والی تھا۔ جو یوم الحرہ کی مشہور عجمی جنگ میں پیل سفید کے پاؤں تلے کچلا گیا تھا، ۶۰ ھ میں جب مسلم بن عقیل کوفہ میں تشریف لائے تو وہ پہلے مختار ہی کے گھر ٹھہرے تھے، بعد میں ہانی بن عروہ کے ہاں تشریف لے گئے تھے۔ اسی جرم کی پاداش میں ابن زیاد نے مختار کو جیل بھیج دیا تھا، سانحہ شہادت کے بعد مختار کو رہا کر دیا گیا، مختار سمجھتا تھا کہ اب اس کے عروج کا زمانہ قریب ہے۔ وہ سیدھا مکہ میں حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا، چوں کہ حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ خود بہت بڑے مدبر، دانا اور ماہر سیاست تھے۔ اس لیے مختار کو یہاں اپنی حیثیت صرف ضمنی اور جزوی نظر آئی، بالآخر وہ حضرت محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ

(حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صاحب زادے جو سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بطن اطہر سے نہیں تھے)
سے ایک اہم سرنوشت لکھوا کر کوفہ چلا آیا---

انتقام کربلا کا ولولہ مسلمانوں میں ایک آتشیں سرنگ کی حیثیت اختیار کر چکا تھا کہ جب کوئی چاہتا، اسے آگ دکھا کر کوہ آتش فشاں بنا سکتا تھا۔ عراق میں ''توابین'' کی تحریک صرف انہی مقاصد کے لیے معرض وجود میں آئی تھی، اب اس ماحول میں مختار جیسے عیار (جو کئی دفعہ جیلوں سے پراسرار طریقوں سے فرار ہو چکا تھا اور اپنی نت نئی چالاکیوں سے پبلک کو ورطہ حیرت میں ڈال دیتا تھا) کی کامیابی میں کیا رکاوٹ ہو سکتی تھی؟---

چناں چہ اس نے انتقام کربلا کے نعروں کے ساتھ اپنی بیعت کا سلسلہ جاری کر دیا، انہی ایام میں ایک دوسرے شخص سلیمان بن حرورہ کے اردگرد چھبیس ہزار کا ایک انبوہ جمع ہو گیا، مختار سے پہلے یہ لوگ شام کی طرف کوچ کر گئے، راستے میں عین الورد کے مقام پر شامی فوج کے ساتھ ان کی خون ریز جنگ ہوئی۔ اگرچہ اس جنگ میں عساکر شام کے بہت سے کمانڈر میدان میں کھیت رہے لیکن آخر عراقی پسپا ہو کر کوفہ چلے آئے، سلیمان میدان میں کام آ گیا، جب شکست خوردہ فوج کوفہ واپس آئی تو مختار گورنر کوفہ کی قید میں تھا، لوگوں نے کہا کہ ہم تجھے جیل سے رہا کراتے ہیں، وہ کہنے لگا:

تم خاموش رہو، میں خود بخود رہا ہو جاؤں گا--- اور واقعی کچھ دن گزرے تھے کہ وہ رہا کر دیا گیا---

اب مختار کی بیعت و امارت کے دروازے کھل رہے تھے، ادھر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے سابقہ گورنر کی جگہ عبداللہ بن مطیع کو عراق کا گورنر بنا دیا، اسی تبدیلی کے دوران میں مختار کے ہاتھ پاؤں مضبوط ہو گئے تھے، یہاں تک کہ اس نے نئے گورنر کے خلاف قتال شروع کر دیا اور اسے کوفہ سے نکال باہر کیا اور خود کوفہ کی

[illegible]

آخر جلاد بھیجے گئے اور عمرو بن سعد اور حفص بن عمرو کے سر کاٹ کر حضرت محمد بن

حنفیہ کی خدمت میں روانہ کر دیے---

خولی بن یزید کے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں کاٹے گئے، پھر سولی پر لٹکا دیا گیا اور لاش جلا کر اس کی راکھ ہوا میں اڑا دی گئی---

سنان اور شمر کو قتل کر کے ان کی لاشوں پر گھوڑے دوڑائے گئے اور ان تمام قاتلوں کے سر، سیدی محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ کے پاس مدینہ بھجوائے گئے۔ مختار نے اپنے پولیس کپتان عبداللہ بن کامل کو ایک فہرست بنانے کا حکم دیا، جس میں ان تمام فوجیوں کے نام درج کرنے کی ہدایت کی گئی، جنہوں نے جنگ کربلا میں حصہ لیا تھا۔ نیز یہ حکم دیا کہ ہر ایک کے جرم کی تفصیل لکھو کہ کس نے نیزہ مارا، کس نے تیر چلایا، کس نے تلوار کا وار کیا، کس نے لباس اتارا، کس نے شہید کیا، کس نے سر انور کاٹا اور کس نے گھوڑا دوڑایا؟---

پھر یہ اہتمام کیا گیا کہ ہر مجرم کو اُس کے کیے ہوئے جرم کی مناسبت سے اس ہی شکل میں ہلاک کیا جاتا تھا---

مختار نے اپنی اس تحریک میں ہزار ہا عراقیوں کا خون گرایا اور یقین کامل سے کہا جاتا ہے کہ اس نے کسی مجرم کو بچنے کا موقع نہ دیا۔ سب از حد ذلت و رسوائی، بے بسی اور بے چارگی کے عالم میں موت کے غار میں دھکیل دیے گئے۔ یہ تھا کوفہ کے ظالموں کا انجام:

رائیگاں جاتا تھا خون شہیدان وفا
رنگ لائے گی ہماری جاں سپاری ایک دن

جب مختار کوفہ کی شورشوں اور مجرموں کے قتل سے فارغ ہوا تو اشتر نخعی فوج لے کر دوبارہ موصل کی طرف چل نکلا۔ ادھر ابن زیاد نے موصل سے پانچ فرسخ دور

دریائے خارز پر خیمے ڈال دیے۔اشتر بھی اپنی فوج سمیت مارچ کرتا ہوا، شامی افواج کے سامنے جا پہنچا۔رات کی تاریکی میں ابن زیاد کے ایک فوجی افسر نے اشتر نخعی سے مل کر کہا کہ میں کل ٹھیک بھڑکتی ہوئی جنگ کے دوران میں اپنے دستے سمیت تم سے آ کر مل جاؤں گا---

صبح کو خاور تاباں طلوع ہوا، دریائے خارز کے کنارے پر عراقیوں اور شامیوں کی خوں ریز لڑائی شروع ہوگئی۔جب لڑائی اپنی شدت اور جوانی پر تھی تو عراقیوں کا ایک دستہ پیچھے ہٹنے لگا، ایک عراقی کمانڈر نے چیخ کر کہا:

"کوفہ والو! کہاں بھاگتے ہو، کوفہ تو پہنچ نہیں سکتے"---

یہ فقرہ سن کر ان کے قدم جم گئے۔ادھر رات والا شامی کمانڈر اپنے قبیلے کے جوانوں کو ساتھ لے کر اشتر نخعی کی قطاروں میں آ ملا، اب میدان کا نقشہ بدل چکا تھا۔شامی سپاہیوں کے قدم اکھڑنے لگے، کوفیوں نے بڑھ کر انہیں تلوار کی باڑ پر رکھ لیا، جو کوفیوں سے بچ کر پیچھے ہٹتے، دریا میں غرق ہو جاتے۔خون اور خاک کے اس تاریک بادل میں ابن زیاد کہیں نظر نہیں آتا تھا، لیکن اشتر نخعی نے چلا کر کہا:

"ابن زیاد کا سر قلم کر کے لاؤ"---

سپاہی تلاش کے لیے دوڑے، شام ہو رہی تھی، سورج غروب ہو رہا تھا، جب کہ ابن زیاد پر ایک عراقی سپاہی کی نظر پڑی، چناں چہ عراقی نے اس کی زندگی کا سورج ہمیشہ کے لیے غروب کر دیا اور سر کاٹ کر اپنے امیر کی خدمت میں پیش کر دیا---

یہ عظیم الشان فتح حاصل کر کے اشتر کوفہ آیا، مختار نے دربار لگایا اور اپنی مشہور و معروف طلائی کرسی پر براجمان ہوا، جب کوفہ کے گورنمنٹ ہاؤس میں مختار کے سامنے ابن زیاد کا سر ایک طشتری میں پیش کیا گیا تو عبرت و رقت کا ایک عجیب سماں بندھ گیا تھا۔کیوں کہ

آج محرم الحرام کی وہی دس تاریخ تھی، کوفہ کا وہی قصر الامارت تھا، جہاں آج سے چھ برس پہلے فاطمہ رضی اللہ عنہا کے لال کا سر انور ابن زیاد کے سامنے لایا گیا تھا---

اور آج ابن زیاد کا سر بعینہٖ اسی طرح، اسی تاریخ اور اسی قصر حکومت میں فرماں روائے وقت کی خدمت میں پیش کیا جا رہا تھا---[۱]

فرق صرف اتنا تھا کہ وہ ۶۱ھ کی دس محرم الحرام تھی اور یہ ۶۷ھ کی دس محرم تھی---

اللہ غنی!

تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ---[آل عمران:۱۴۰]

لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ---[الحشر:۲۱]

نہ یزید کا وہ ستم رہا نہ زیاد کی وہ جفا رہی
جو رہا تو نام حسین کا جسے زندہ رکھتی ہے کربلا

[۱]......خدا کی شان ہے، عبد الملک نے آگے چل کر اس محل کو مسمار کر دیا، گویا اللہ تعالیٰ نے اس عمارت کو بھی مٹا دیا جس میں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے سر انور کی توہین کی گئی تھی---

سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کا موقف کیا تھا؟

(شبہات اور ان کے جوابات)

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

[مولانا محمد علی جوہرؔ]

سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کا موقف کیا تھا؟

سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کے سفر عراق اور اسی سلسلے کے دیگر اقدامات کا مقصد کیا تھا؟---
اس سوال کے مختلف جوابات دیے گئے ہیں، کسی نے کہا یہ سفر محض جنگ اقتدار کا سفر تھا، کسی نے خیال کیا کہ یہ آپ کی اجتہادی غلطی کا نتیجہ تھا، بعض نے سمجھا کہ آپ حصول خلافت کے لیے کوشاں تھے، بعض کی رائے ہوئی کہ آپ محض کوفیوں کے بلانے پر چلے گئے اور کسی کا نظریہ ہے کہ آپ کلمہ حق بلند کرنا چاہتے تھے۔ غرض یہ کہ کوئی آپ کے طرز عمل کو برحق سمجھتا ہے اور کوئی یزید کی حکومت کے اقدامات کو درست قرار دیتا ہے---

اس مسئلے میں جو اختلاف نظر آ رہا ہے، وہ زیادہ تر ایک دوسرے سوال کے جواب سے پیدا ہوتا ہے اور وہ سوال یہ ہے کہ حکومت وقت کے خلاف خروج (بغاوت کے لیے نکلنا) کب جائز، کب نا جائز اور کب ضروری ہوتا ہے۔ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ حکومت اسلامی ہے یا غیر اسلامی، اگر غیر اسلامی ہے تو مسلم حکومت [ا] ہے یا غیر مسلم۔ اور مسلم ہے تو عادل حکومت ہے یا غیر عادل، اسی طرح خروج کے متعلق یہ اندازہ لگانا ضروری ہوتا ہے کہ آیا انقلاب کی کامیابی کے امکانات موجود ہیں یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ ان مختلف صورتوں میں سوال کا جواب یقیناً مختلف ہو جائے گا۔ پھر یزید کی حکومت کس قسم کی تھی اور اس وقت خروج کی فضا سازگار تھی یا نہ تھی؟ اس کے متعلق بھی مختلف اذہان میں الگ الگ رائیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی بہت سے سوچنے والے عقیدت، عصبیت یا تعصب سے ہٹ کر نہیں سوچتے۔ لٰہذا صحیح اور واقعی جواب سامنے آنا، ایک دشوار امر بن کر رہ جاتا ہے۔ مذکورہ تفصیل سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ اصل مسئلہ پر غور کرنے کے لیے دو چیزوں پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ یزید کی حکومت کی نوعیت کیا تھی اور دوسری یہ کہ سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کا موقف کیا تھا؟---

یزید کی حکومت

یزید کی حکومت سے بحث کرتے ہوئے مذکورہ تفصیل کے علاوہ پہلا سوال یہ ہوگا کہ آیا یہ حکومت شرعی حیثیت سے تسلیم شدہ تھی یا نہیں؟ اس مسئلہ پر اس عہد میں

[ا]...... جب ریاست میں اسلامی قانون نافذ ہو تو حکومت اسلامی ہے اور اگر ایسا نہ ہو لیکن حکمران مسلمان ہو تو یہ مسلم حکومت کہلاتی ہے---

دونوں رائیں موجود تھیں:

❶ کچھ لوگ اس طرح سوچتے تھے کہ چوں کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی دست برداری کے بعد حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ متفقہ طور پر خلیفہ [۱] تھے، لہٰذا ان کا مقرر کردہ جانشین یزید بھی مسلّم حیثیت کا حکمران تھا اور پھر اکثر مسلمانوں نے اس کی بیعت بھی کر لی تھی---(۲)

❷ اس کے برعکس اکثر اہل علم وفضل وہ تھے جو یزید کے تقرر کو تسلیم نہ کرتے تھے کیوں کہ ان کی رائے میں اس کا تقرر اسلامی اصول کے مطابق نہ تھا، نیز اس کا فسق و فجور بھی معروف تھا اور اہل مدینہ، اہل مکہ اور اہل عراق کو اس کی بیعت سے بھی انکار تھا۔ صحابہ کرام اور اکثر اکابر امت در حقیقت یہی رائے رکھتے تھے، یزید کی حکومت کے بارے میں آخری رعایت ملحوظ رکھ لی جائے، تو بھی صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اس کی حکومت ایک تسلیم شدہ [۳] حکومت تھی، تاہم اسے اسلامی حکومت [۴] ہرگز قرار نہیں

---

[۱]......خلیفہ کا لفظ، سلطانِ اسلام کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے---

[۲]......ناصبی فرقہ، اس رائے میں اتنا انتہا پسند واقع ہوا ہے کہ وہ یزید کو امیر المومنین یزید رحمۃ اللہ علیہ اور سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کو باغی کہتے ہیں۔ لیکن یہ رائے یا تو اس شخص کی ہو سکتی ہے جو حقائق اور واقعات سے بے خبر ہو اور یا اس کی، جو بغض اہل بیت میں حد درجہ کا تعصب رکھتا ہو، نعوذ باللہ من ذلك---

[۳]......گو کہ جبر و تشدد اور دھاندلی کے ساتھ اسلامی دنیا کے اکثر حصے پر تسلط قائم رکھا گیا تھا---

[۴]......جس کے خلاف بغاوت کرنا بہت بڑا گناہ ہوتا ہے اور ایسی بغاوت کو کچل دینا مسلمانوں کے لیے ضروری ہوتا ہے---

دیا جا سکتا، صرف مسلم حکومت کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یزیدی حکومت بہر حال ایک غیر عادل اور غیر صالح حکومت تھی---

یزیدی حکومت کی نوعیت معلوم کرنے کے بعد خروج کا مسئلہ بھی معلوم کر لینا چاہیے۔ جب حکومت مذکورہ نوعیت کی ہو (یعنی غیر عادل، غیر صالح بلکہ فسق و فجور کی ترجمان ہو) تو دیکھا جائے گا کہ آیا ایک اچھے انقلاب کے پیدا ہونے کے امکانات ظاہر ہیں یا نہیں۔ اگر انقلاب کی کامیابی کے آثار واضح نظر آتے ہوں تو فقہی نکتہ نظر سے ایسی حکومت کے خلاف خروج کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر یہ امکانات دکھائی نہ دیتے ہوں تو پھر مذکورہ قسم کی حکومت کے بارے میں مختلف اجتہادی آراء پیش کی گئی ہیں:

۱ بعض نے کلمہ حق کہہ دینا ہی کافی سمجھا ہے---

۲ بعض نے عملی قدم اٹھانے، یعنی خروج کرنے اور شہید ہو جانے کو ترجیح دی ہے---

۳ بعض نے اصلاح اور بہتری کی توقعات پر حکومت کے ساتھ مل کر کام کرنا اور تعاون کرنا مناسب قرار دیا ہے---[۱]

---

[۱]......اس سلسلے میں یہ حقیقت بھی مدنظر رہے کہ ہر دور میں حالات مخصوص اور مختلف ہوا کرتے ہیں۔ لہٰذا کسی ایک دور کی حکومت کے مخصوص حالات پر غور کرنے کے بعد ہی ان مذکورہ آراء میں سے کوئی ایک رائے اختیار کی جا سکتی ہے۔ اس لیے اس معاملے کا فیصلہ بالآخر صاحب حالات کی اپنی دیانت دارانہ سمجھ پر ہی موقوف ہوتا ہے اور یہی سبب ہے کہ بعض اوقات ایک ہی دور میں ایک ہی نوعیت کی حکومت کے متعلق مختلف اصحاب کے نظریات الگ الگ ہو جایا کرتے ہیں---

سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کا موقف

اب یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ۶۰ھ، بمطابق ۶۸۰ء کے سیاسی حالات میں سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کا موقف کیا تھا؟ اس چیز کی وضاحت کے لیے تین باتیں معلوم کرنا ضروری ہیں:

۱ یزید کی حکومت کے متعلق آپ کی رائے کیا تھی؟---

۲ آپ امت کے لیے کیسی حکومت چاہتے تھے؟---

۳ کیا آپ کے ذہن میں کوئی عملی پروگرام تھا، اگر تھا، تو وہ کیا تھا؟---

یزید کی حکومت کے متعلق آپ کی رائے وہی تھی، جو اس عہد کے دیگر اکابر ملت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تھی---یعنی یہ اس شخص کی حکومت تھی، جس کی اپنی زندگی بھی غیر اسلامی تھی اور جس کی سلطنت میں بھی اسلامی اقدار پامال کی جا رہی تھیں۔ آپ نے یہ اپنی رائے مختلف مواقع پر ظاہر فرما دی تھی، سفر کوفہ کے دوران مقام بیضہ پر اپنی تقریر میں آپ نے ارشاد فرمایا تھا:

اِنَّ هٰؤُلَاءِ قَد لَزِمُوا طَاعَةَ الشَّيطَانِ وَ تَرَكُوا طَاعَةَ الرَّحمٰنِ وَ اَظهَرُوا الفَسَادَ وَ عَطَّلُوا الحُدُودَ وَ استَاثَرُوا بِالفَيءِ---

[طبری، جلد ۷، صفحہ ۳۰۰]

"بے شک ان لوگوں نے شیطان کی پیروی قبول کر رکھی ہے اور رحمٰن کی اطاعت چھوڑ دی ہے۔ فتنہ و فساد پھیلا رکھا ہے، احکام الٰہی کو معطل کر دیا ہے اور مال غنیمت میں ناجائز تصرف کرتے ہیں"---

اسی رائے کے پیش نظر مدینہ میں، جب یزید کے عامل نے آپ سے بیعت کا مطالبہ کیا، تو آپ نے انکار کر دیا تھا اور آخر دم تک اسی رائے پر قائم رہے---

۲ جب آپ یزید کے طرزِ حکومت کو پسند نہیں کرتے تھے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ امت مسلمہ کے لیے کیسی حکومت چاہتے تھے؟ اس سوال کا جواب بھی آپ نے واضح فرما دیا تھا۔ کوفیوں نے آپ رضی اللہ عنہ کو دعوت کے جو خطوط لکھے، ان میں یہ فقرہ بھی تھا:

اِنَّـهٗ لَیْسَ عَلَیْنَا اِمَامٌ فَاَقْبِل لَعَلَّ اللّٰهَ اَن یَّجمَعَنَا بِكَ عَلَى الحَقِّ---[کامل اثیر، جلد ۴، صفحہ ۱۰]

''حقیقت یہ ہے کہ ہم پر کوئی امام نہیں، پس آپ تشریف لائیے تاکہ اللہ آپ کے ذریعے ہمیں حق پر جمع کر دے''---

چوں کہ اس فقرے میں انقلاب حکومت کی طرف واضح اشارہ تھا، اس لیے اپنے جواب میں امامت اور حکومت کی وہ تشریح کر دی، جو آپ کے ذہن میں متعین تھی:

اَمَّــا بَعدُ فَقَد فَهِمتُ كُلَّ الَّذِی اِقتَصَصتُم فَلِعُمرِی مَا الاِمَامُ اِلَّا العَامِلُ بِالکِتَابِ وَ القَائِمُ بِالقِسطِ وَ الدَّائِنُ بِدِینِ الحَقِّ و السَّلَامُ---[ابن اثیر، جلد ۴، صفحہ ۱۰]

''حمد و صلوٰۃ کے بعد، میں تمہاری ساری گفتگو کو سمجھ گیا ہوں، لیکن مجھے اپنی جان کی قسم، امام صرف وہی ہو سکتا ہے، جو کتاب اللہ کے مطابق طرزِ عمل اختیار کرے اور انصاف کو قائم کرے اور دینِ حق کی اطاعت کرے---

فقط والسلام''---

یہ وضاحت آپ نے اس لیے ضروری سمجھی تاکہ ان لوگوں پر انقلاب کا صحیح مفہوم

ظاہر ہو جائے، جو انقلاب کی خواہش میں آپ کو مراسلے پہ مراسلہ لکھے جا رہے تھے اور تا کہ وہ اس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ انقلاب کا مفہوم ایک خاندان کی جگہ دوسرے خاندان کا برسرِ اقتدار آ جانا ہے۔ اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے ذہن میں عراقی اور شامی یا اموی اور ہاشمی کا سوال نہ تھا، بلکہ اگر خیال تھا تو کتاب و سنت کے احکام اور حدودِ الٰہی کے قیام کا خیال تھا۔ آپ نے اپنے یہ نظریات، اپنے رفقاء پر بھی واضح فرما دیے ہوئے تھے۔

چناں چہ جب کوفہ میں ابن زیاد نے حضرت مسلم رضی اللہ عنہ سے کہا:

"تم لوگوں میں تفریق پیدا کرنے کے لیے آئے ہو"---

تو آپ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا تھا:

اَتَیْنَاهُمْ لِنَاْمُرَ بِالْعَدْلِ وَنَدْعُوَ اِلٰی حُکْمِ الْکِتَابِ---[طبری، جلد ۷، صفحہ ۲۶۶]

"ہم ان کے پاس اس لیے آئے ہیں کہ انہیں انصاف کا حکم دیں اور ان کو قرآن کے قانون کی طرف بلائیں"---

ان باتوں سے طرزِ حکومت کے بارے میں وہ نظریہ، جو امام حسین رضی اللہ عنہ اپنے ذہن میں رکھتے تھے، بآسانی معلوم ہو جاتا ہے---

۳ اب تیسرا سوال سامنے آتا ہے کہ آیا، آپ کے ذہن میں اپنے ان نظریات کو بروئے کار لانے کے لیے کوئی عملی پروگرام بھی تھا اور کیا آپ اسے اختیار کرنا چاہتے تھے یا کہ نہیں؟---

اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے ہمیں اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ یزید کی حکومت کے خلاف خروج کرنے کے لیے فقہی حکم کیا تھا، جیسا کہ پیچھے گزرا ہے۔ اس معاملے کی دو صورتیں ہوتی ہیں:

ا...... جب صالح انقلاب کے لیے کامیابی کے آثار نظر نہ آتے ہوں اور اس میں تین طرح کے طرزِ عمل اختیار کیے جاسکتے ہیں:

① جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، یعنی کلمہ حق کہنے پر اکتفا کرنا---

② بعض عملی قدم اٹھانا، یعنی خروج کرنے اور شہید ہونے کو ترجیح دینا---

③ اصلاح و بہتری کی توقعات پر حکومت کے ساتھ مل کر کام کرنا اور تعاون کرنا---

۲...... جب کامیابی کی توقعات بالکل عیاں ہوں، اس صورت میں خروج ضروری ہوتا ہے---

لیکن اس بات کا فیصلہ کرنے کے لیے کہ اس عہد میں پہلی صورت کے حالات پائے جارہے تھے یا دوسری کے۔ گہرے غور وفکر اور ملکی سیاست کے محتاط مطالعے کی اشد ضرورت تھی اور یہ غور و مطالعہ، دو چیزوں کے بغیر ممکن نہ تھا---

پہلی چیز یہ کہ آپ کی زندگی اور آزادی خطرے سے باہر ہو اور دوسری یہ کہ فراغت کا ایک عرصہ مہیا ہو۔ چناں چہ ان ہی دو چیزوں کی تلاش میں آپ نے اپنی محبوب بستی مدینۃ الرسول [۱] سے رخصت ہونا اختیار کیا۔ سیدی محمد بن حنفیہ [۲] کا مشورہ بھی اسی چیز پر مبنی تھا---

[۱]...... مدینہ میں چوں کہ آپ نے بیعت سے انکار کردیا تھا، لہٰذا اب وہاں حفاظت، فراغت اور سکون ذہن کا میسر آنا نہایت دشوار تھا۔ چوں کہ یزید نے اپنے حاکم مدینہ کو جو حکم نامہ بھیجا تھا، اس کا آخری فقرہ یہ تھا، بِالْبَیْعَةِ اَخْذًا لَیْسَ فِیْهِ رُخْصَةٌ---[ابن اثیر، جلد۴، صفحہ۶] ''بیعت لو اور ایسی گرفت کرو، جس میں کوئی رعایت نہ ہو، تاوقتیکہ بیعت کرلیں''---

[۲]...... ان کے مشورے کا خلاصہ یہ تھا کہ آپ مکہ جائیں اور جب تک ملک کا کوئی واضح فیصلہ نہیں ہوتا، حالات پر غور کریں---[ابن اثیر، جلد۴، صفحہ۸]

مدینہ سے رخصت ہو کر سفر کوفہ تک سوا چار مہینے کا عرصہ آپ نے مکہ [ا] میں گزارا اور حالات کا مطالعہ کرتے ہوئے گزارا--- اس وقت اسلامی دنیا کے حالات نہایت ہی عجیب وغریب اور متضاد و متعارض واقع ہوئے تھے۔ بہت سی چیزیں ایسی تھیں، جو انقلاب کی کامیابی کی توقع دلاتی تھیں۔ جو مندرجہ ذیل تھیں:

① ملک میں ایک گروہ ان ممتاز اور اہل فضل لوگوں کا موجود تھا، جنہوں نے نہ یزید کے تقرر کو تسلیم کیا اور نہ اس کے حق میں بیعت کی تھی۔ ایسے لوگوں کی تو ایک بڑی اکثریت موجود تھی، جنہوں نے گو بیعت کر لی تھی مگر وہ دل سے حکومت وقت کو قطعاً پسند نہ کرتے تھے---

② مکہ، مدینہ، کوفہ اور بصرہ بلکہ پورے حجاز اور عراق، نیز یمن اور طائف کے علاقوں میں سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کے حق میں گہری عقیدت اور محبت پائی جاتی تھی---

③ اہل عراق کی رائے کو ان حالات میں بہت بڑی سیاسی اہمیت حاصل تھی، کیوں کہ عراقیوں اور شامیوں میں زبردست کشیدگی پیدا ہو چکی تھی---

یہ عراقی ہی تھے، جو حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں شامی لشکروں کے خلاف نبرد آزما رہے---

عراق والوں میں خاندان علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی حمایت ایک مذہبی شعار کی سی حیثیت اختیار کر چکی تھی اور وہ امویوں کی بالا دستی کو کبھی بھی پسند نہ کرتے تھے---

---

[ا]......مکہ حرم ہونے کی وجہ سے کسی حد تک محفوظ مقام تھا اور نیز فریضہ حج کی وجہ سے مسلمانوں کا مرکز اور مرجع تھا۔ لہٰذا یہاں امن کے ساتھ مسلمانوں کے خیالات کا جائزہ لیا جا سکتا تھا، چناں چہ آپ ایام حج تک مکہ میں مقیم رہے---

ان حالات میں کم ازکم کوفہ میں بہت جلد ایک متوازی ریاست قائم ہوسکتی تھی اور صرف اسی پر معاملہ رک نہ جاتا، بلکہ شجر انقلاب کے مزید پھلنے پھولنے کے آثار بھی موجود ہو جاتے، کیوں کہ اگر کوفیوں اور عراقیوں کو استقلال کی توفیق مل جاتی اور وہ اپنے ارادوں اور وعدوں پر ڈٹ جاتے، تو جلد بصرہ، مکہ، مدینہ، یمن اور طائف کے قبائل بھی بیدار ہو جاتے---[ا]

یہ تو وہ حالات تھے، جو انقلاب کے حق میں جاتے ہوئے نظر آ رہے تھے، لیکن معاملے کا ایک دوسرا پہلو بھی موجود تھا، جو اس وقت کے اہل نظر پر پوشیدہ نہ تھا اور وہ یہ تھا کہ اگر کسی قسم کی عملی تحریک شروع ہونے کا وقت آتا تو اس کی ابتداء تین مقامات میں سے کسی ایک جگہ سے ہوسکتی تھی---

۱ مدینہ

۲ مکہ

۳ کوفہ---

لیکن مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ کے احترام کے پیش نظر یہاں سے خود حضرت سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ انقلابی کام کا آغاز پسند نہ فرماسکتے تھے---

اب لے دے کے کوفہ پر نظر اٹھتی تھی۔ اہل کوفہ گو حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے بہی خواہ اور حامی چلے آئے تھے، حتیٰ کہ کوفہ کو عہد علوی میں دارالخلافہ بنالیا گیا تھا۔ تاہم ان کے حالات کچھ قابل اعتبار نظر نہ آتے تھے اور حضرت امام اس بات کو یقیناً ذہن میں رکھتے تھے---

[ا]......سفر کوفہ کے دوران آپ نے بصرہ کے ایک سردار کو خط لکھا تھا۔ اس نے شہر کے معزز لوگوں کو جمع کیا اور ان سے حضرت امام رضی اللہ عنہ کے بارے میں رائے معلوم کی۔ ان سب نے آپ کی حمایت کا وعدہ کیا اور قاصد کو خط دے کر آپ کے پاس جانے کے لیے تیار کیا گیا، مکہ میں اکابر صحابہ نے کہہ دیا تھا کہ آپ یہاں تحریک شروع کریں تو ہم آپ کی بیعت کرتے ہیں۔ اسی طرح مدینہ، یمن اور طائف میں بھی آپ کے عقیدت مندوں کی کثرت تھی---

اگر آپ کو اہل کوفہ پر کامل اعتماد ہوتا، تو ان کے سیکڑوں خطوط کے بعد حضرت مسلم کو حالات کی خبر لینے کے لیے روانہ کرنے کی ضرورت محسوس نہ فرماتے---

حالات کے ان مختلف اور متضاد پہلوؤں میں محض سطحیت اور جلد بازی سے کوئی فیصلہ کرنا نہایت خطرناک ہوتا، کیوں کہ غلط فیصلہ ساری امت کو جنگ کے میدانوں میں کھڑا کر دینے کا موجب بن جاتا اور آپ تو ایک ایک مسلمان کی جان کو از حد عزیز رکھتے تھے---[۱]

لہٰذا آپ نے حالات پر بار بار غور کیا، ایام حج تک مسلمانوں کے حالات کا جائزہ لیا اور وقت کی سیاست کے ہر گوشے کو بار بار پڑھا اور بالآخر اس طویل اور گہرے غور وفکر کے بعد اور اوپر مذکور ہونے والے انقلابی امکانات کے باوجود بھی آپ کی رائے یہی قرار پائی کہ ہم اس حالت میں نہیں کہ جس میں خروج کرنا لازمی اور ضروری ہوا کرتا ہے---

مگر یہاں سوال اٹھے گا کہ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کے نزدیک مذکورہ حالات میں خروج کے لازم ہونے کی صورت واقع نہ تھی اور یہ کہ آپ نے حکومت وقت کے خلاف خروج ضروری نہیں سمجھا تھا---

تو اس کا جواب یہ ہے کہ آپ خروج کے حق میں ہوتے، یعنی خروج کو شرعی لحاظ سے فرض سمجھے ہوئے ہوتے تو رجب کی آخری تاریخوں سے لے کر ذی الحجہ کے پہلے ہفتے تک کی مدت میں اس کے لیے کوئی تیاری ضرور کرتے---

کیوں کہ جو چیز شرعی اور دینی لحاظ سے ضروری قرار پائے، اس کے مبادی (تیاری کے ابتدائی مرحلے) اور اسباب و وسائل مہیا کرنا بھی لازم اور ضروری قرار پاتے ہیں اور اس مدت میں عسکری تیاریاں (گو خفیہ سہی) کی جا سکتی تھیں۔ مختلف علاقوں میں

---

[۱]...... سفر کربلا کے آخری ایام میں جب اپنے آپ کو دشمن کے نرغے میں کھڑا ہوا پا رہے تھے اور اس وقت ایک ایک سپاہی کا ساتھ آپ کی حفاظت کے لیے نہایت ضروری تھا مگر پھر بھی آپ اپنے ساتھیوں کو کہتے رہے کہ تم اپنی جانیں بچا کر کسی طرف کو نکل جاؤ---

داعی بھیجے جا سکتے تھے اور تحریک کے لیے رضا کار جمع کیے جا سکتے تھے یا کم از کم ملک کے کونوں میں بسنے والے تمام مسلمانوں پر اپنا پروگرام تو واضح کیا جا سکتا تھا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ آپ نے ان امور میں سے کوئی امر بھی اختیار نہیں کیا، جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنے آپ کو خروج کے لازم ہونے والی صورت میں نہیں دیکھ رہے تھے اور نہ خروج کے متعلق آپ کوئی رائے رکھتے تھے---[۱]

آپ کی بصیرت

عدمِ خروج کے اس فیصلے سے جس طرح آپ کی امن پسندی اور امت کی عافیت خواہی کا پتا چلتا ہے، اسی طرح سیاست اور ملکی معاملات میں آپ کی گہری بصیرت کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کل کے سطحی اور عام سیاست دانوں کی طرح کا کوئی شخص ان حالات میں ہوتا تو وہ یقیناً فضا کا ظاہری رخ دیکھ کر غلطی کھاتا اور ملک میں پروپیگنڈہ کی لہریں دوڑا کر، امت کو ایک خطرناک داخلی جنگ میں مبتلا[۲] کر دیتا۔

[۱]......سفر کوفہ کو خروج سمجھنا ٹھیک نہیں---

[۲]......ذرا فرض کیجیے، اگر حضرت امام عام جنگ کی تیاری کرتے اور ایک دفعہ حکومت وقت کے خلاف اعلان جنگ ہو جاتا تو آپ کی لاکھ کوششوں کے باوجود یہ جنگ اموی اور ہاشمی، عراقی اور شامی کی جنگ بن کر رہ جاتی اور اگلی اور پچھلی کشیدگیوں کے جذبے اس چنگاری کو ایسا کوہ آتش فشاں بنا دیتے کہ جب تک ایک ایک اموی اور ایک ایک ہاشمی زندہ رہتا اس وقت تک یہ جنگ ختم نہ ہوتی، یہاں یہ بات سمجھ میں آئے گی کہ حضرت امام سفر کوفہ کے وقت پیش کشوں کو کیوں ٹھکرا دیتے تھے، جن سے آپ کی طاقت میں اضافہ ہوتا ہوا نظر آتا۔ ایک شخص نے آخری دنوں میں عرض کی کہ آپ ہمارے پہاڑ پر چلیے، وہاں بیس ہزار کی فوج آپ کی امداد کے لیے تیار ہو جائے گی لیکن آپ نے انکار کر دیا تھا، وجہ یہی تھی کہ طاقت جمع کرنا اور عام جنگ کے حالات پیدا کر دینا مسلمان اور عالم اسلام کے لیے سخت تباہ کن چیز تھی---

لیکن آپ نے پیش آمدہ مسائل میں اپنی راہ اس طرح سے متعین فرمائی کہ گویا آپ حالات کے سینے میں اتر گئے تھے اور وقت کی نبض آپ کی انگلیوں میں چل رہی تھی۔ اسی طرح اس فیصلے سے آپ کی شرعی بصیرت اور تفقہ واجتہاد کا مقام بھی معلوم ہوتا ہے---

اوپر کی سطور سے معلوم ہوا کہ سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے آپ کو اس حالت میں نہ سمجھا تھا، جس میں خروج ضروری ہوتا ہے، لہٰذا مسئلے کی دوسری صورت سامنے آتی ہے، یعنی جس میں حکومت وقت غیر عادل وغیر صالح ہوتی ہے، لیکن اچھے انقلاب کے آثار بھی نمایاں نہیں ہوتے۔ اس صورت میں فقہی حکم تین طریقوں میں بیان کیا گیا ہے[ا]:

۱ کلمہ حق کہنے پر کفایت کرنا---

۲ اصلاح کی توقع پر حکومت سے تعاون کرنا---

۳ اسباب نہ ہونے کے باوجود خروج کرنا اور شہادت پانا---

اب سوال یہ ہے کہ حضرت امام رضی اللہ عنہ کے طرز عمل سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ پہلی صورت (خروج کو ضروری سمجھنا) کے حق میں نہ تھے، تو یقیناً آپ کے نزدیک دوسری صورت متحقق ہوگی، لہٰذا مذکورہ تین راہوں میں آپ نے کون سی راہ اختیار کی، اس کا جواب یہ ہے کہ آپ نے پہلا طرز عمل یعنی باطل کے خلاف کلمہ حق کہہ دینا اختیار فرمایا تھا اور آپ کی طرف سے یہ فریضہ اسی وقت ادا ہوگیا تھا، جب آپ نے مدینہ منورہ میں بیعت سے انکار کیا---

کیوں کہ بیعت سے انکار کا مفہوم ہی یہ تھا کہ آپ حکومت وقت کے اطوار کو پسند نہیں کرتے اور احتجاجاً بیعت سے انکار کر رہے ہیں۔ اس کے بعد جہاں کہیں ضرورت پیش آئی، وہاں بھی آپ نے کلمہ حق بلند کیا۔ جیسا کہ مقام بیضہ کا خطبہ پیچھے گزرا،

[ا]......یہ تفصیل پیچھے گزر چکی ہے مگر سہولت کے لیے یہاں پھر دہرائی گئی ہے---

جس میں آپ نے صاف فرما دیا تھا کہ حکومت، کتاب اللہ کے قوانین اور حدود الٰہی کی خلاف ورزی کرتی ہے---

اسی طرح آپ وقتاً فوقتاً یزیدی حکومت کے غیر اسلامی اطوار پر تنقید کر کے کلمہ حق کہنے کا فریضہ ادا کرتے رہے۔ دوسرا طریق کار یعنی حکومت کے ساتھ تعاون کرنا، آپ کے نزدیک درست نہیں تھا، کیوں کہ اصلاح اور بہتری کی کوئی امید نظر نہیں آتی تھی۔ یزید کی سیرت اور اس کے طور طریقے ایسے نہ تھے، جن میں تبدیلی کی کوئی توقع کی جا سکتی تھی۔ لہٰذا بیعت سے انکار کر کے آپ نے عدم تعاون کا اعلان کر دیا۔ آپ کی اس رائے کی آنے والے وقت نے تصدیق کر دی۔ یعنی جن نیک اور ارباب فضل لوگوں نے اپنی دیانت دارانہ سمجھ کے مطابق، اصلاح کی امید سے حکومت کے ساتھ تعاون[۱] کیا تھا، ان کے طرز عمل کا کچھ نتیجہ نہ نکلا[۲] اور حکومت کی بدعنوانیاں دن بدن بڑھتی چلی گئیں، یہاں تک کہ حرم خدا پر سنگ باری کا زمانہ بھی مسلمانوں کو دیکھنا پڑا۔ باقی رہا تیسرا طرز عمل، یعنی اسباب نہ ہونے کے باوجود، خروج کرنا اور شہادت پانا۔ سو اگرچہ یہ فضیلت کی بات تھی، کیوں کہ اگر آپ ایسا کرتے، تو عزیمت پر عمل کرتے، لیکن اس سے بھی زیادہ فضیلت اس بات میں تھی کہ آپ ان نازک حالات میں اپنی زندگی کی حفاظت کرتے، تا کہ کسی بھی آڑے وقت میں امت کی قیادت کی علم برداری کرنے کے لیے موجود ہوتے۔ بے شک خدا کی راہ میں جان دینا بہت بڑا مقام ہے، لیکن ایک قیمتی زندگی کو قوم کی رہنمائی کے لیے محفوظ رکھنا، اس سے بھی بڑا

[۱]......یعنی امت کو تفریق سے اور حکومت کو جارحانہ کاروائی سے باز رکھنے کے لیے، یزید کے حق میں بیعت کر لی تھی---

[۲]......لیکن اس معاملہ میں بیعت کرنے والے قصوروار تصور نہیں کیے جا سکتے، کیوں کہ ان کی نیت خیر تھی---

مقام ہے۔اسی لیے مسلمان کو اپنی جان کی حفاظت کرنا فرض قرار دیا گیا ہے۔ یہاں پر یہ حقیقت مدنظر رکھنی چاہیے کہ جب شہادت کے اسباب خود[ا] پیدا ہو جائیں، تو اس وقت بندۂ مومن پیچھے بھی نہیں ہٹتا، لیکن اگر اپنا اصول برقرار رکھنے کے باوجود جان بچانے کے امکانات ہوں تو بندہ مومن خود بخود موت کی طرف بھی نہیں جاتا اور سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کے حالات ایسے ہی تھے۔ کیوں کہ بیعت سے انکار کر کے اور حکومت وقت کی نا اہلی کا اعلان کر کے آپ اپنا فرض منصبی تو ادا کر چکے تھے اور ادا کر رہے تھے اور اگر زندگی ساتھ دیتی تو ادا کرتے رہتے۔ لہٰذا اب آپ کو بغیر تیاری کے خروج کرنے اور اپنے آپ کو تلوار کے سپرد کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

خلاصہ یہ ہوا کہ تین باتوں میں سے آپ نے نہ حکومت کے ساتھ تعاون کرنے کی راہ اختیار کی اور نہ ہی حکومت کے خلاف خروج کرنے کو پسند کیا، بلکہ کلمہ حق کہا اور پوری وضاحت کے ساتھ کہا اور اسی پر کفایت کی---

اگر ایک منصف مزاج اور سلیم العقل انسان اس عہد کے حالات پر پوری دیانت کے ساتھ غائرانہ نگاہ ڈالے، تو وہ یقیناً اس نتیجے پر پہنچے گا کہ ایک ایسا شخص جو ایک طرف وقت کی ظالم و جابر حکومت کی آنکھ میں کھٹک رہا ہو اور دوسری طرف اس کا مقام اور اس کا منصب، اس پر ملت کی رہنمائی کی ذمہ داری ڈال رہا ہو اور وقت کا ہر آنے والا لمحہ اس کے وجود کو اقتدار باطل کے لیے ایک رکاوٹ ظاہر کرتا جا رہا ہو اور ملت کی خدمات کے لیے اس کی زندگی اور سلامتی کو ضروری سے ضروری قرار دے رہا ہو۔ سو اس کے لیے اس موقف سے زیادہ بہتر، زیادہ محتاط اور زیادہ ذمہ دار موقف اور کوئی نہیں ہو سکتا، جو کہ اپنے ان حالات میں سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ نے اختیار کیا تھا۔ یہاں پھر ایک دفعہ

[ا]......جیسے کہ میدان کربلا میں پیدا ہو گئے تھے---

ہم پر آپ کی خداداد بصیرت کا بلند مقام واضح ہوتا ہے---

سفرِ کوفہ

آپ کے موقف کی وضاحت میں جو تشریح یہاں پیش کی گئی ہے، اس کے دوران، پڑھنے والے کو ایک چیز کھٹکتی ہے اور وہ ہے سفرِ کوفہ کا معاملہ---

یعنی جب حضرت امام رضی اللہ عنہ کے موقف میں نہ خروج فرض تھا اور نہ قابل ترجیح، تو پھر آپ کوفہ کس مقصد کے لیے تشریف لے گئے۔ کیوں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ خروج کا موقف نہ رکھنے کے باوجود یہی سفر آپ کی شہادت کا باعث بن گیا۔ اس لیے اس مسئلے کی توضیح کی جاتی ہے۔ یہ بات تعجب کی ہے کہ سفرِ کوفہ کو عموماً سفرِ خروج سمجھا گیا ہے، حتیٰ کہ بعض معروف مولف[۱] بھی یہ بات لکھ گئے ہیں اور اکثر مورخ بھی یہی کچھ کہتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں اور ایسا نہ ہونے کی مندرجہ ذیل وجوہات ہیں:

① جب آپ کی کوفہ کو روانگی کی خبر سنی گئی تو حضرت عبداللہ بن عباس،

[۱]...... "الحسین" کے مؤلف نے لکھا ہے کہ:

"حضرت حسین ایک مقصد اور نظریہ کو سامنے رکھ کر جہاد کے لیے نکلے............ وحدت اسلامیہ کے اسی جذبے کے تحت آپ نے یزید کے خلاف خروج کیا"---

حالاں کہ اس رائے کی غلطی بالکل ظاہر ہے کیوں کہ خود مؤلف نے آپ کی دورانِ راہ کی وہ گفتگوئیں درج کی ہیں، جو خروج کا ارادہ ظاہر نہیں کرتیں۔ مثلاً صفحہ ۱۲۱ پر آپ کا ایک خطبہ دیا ہے:

"اے لوگو! جلدی نہ کرو، پہلے میری بات سن لو............ میرے آنے کی وجہ بھی سن لو، اگر تم میرا عذر قبول کر لو گے............"---

اور پھر آنے کی وجہ کوفیوں کے خطوط کو قرار دیا ہے، جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ خروج کا سفر نہ تھا---

عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم نے فوراً آپ کے پاس پہنچ کر آپ سے سوال کیا تھا کہ آپ کوفہ کیوں جا رہے ہیں؟---

تو ان کے جواب میں آپ نے خروج کا موقف قطعاً بیان نہیں فرمایا۔ علاوہ ازیں راستے میں بھی کئی ممتاز لوگ آپ سے ملتے اور سفر کا مقصود پوچھتے رہے، مگر کہیں بھی آپ نے یہ جواب نہیں دیا کہ میں نے خروج کیا ہے---

② مقام شراف پر جب حر ایک ہزار کا لشکر لے کر آ گیا تو آپ نے ان کے سامنے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ میں کوفیوں کے خطوط اور ان کے قاصدوں کی بنا پر آیا ہوں اور اگر اب تم لوگ مجھے ناپسند کرتے ہو، تو میں واپس جاتا ہوں۔

اصل عبارت کے فقرے درج ذیل ہیں:

و ان لم تفعلوا او كنتم بمقدمی کارهين انصرفت عنكم الى المكان الذی اقبلت منه فسكتوا---

[ابن اثیر، جلد ۴، صفحہ ۲۴]

"اور اگر تم اپنا عہد پورا نہ کرو یا میرے آنے کو پسند نہ کرو تو میں جس مقام سے آیا ہوں، وہیں واپس چلا جاؤں گا، پس وہ خاموش رہے"---

اگر آپ مکہ سے خروج کے ارادے سے چلے ہوتے تو آپ کوفیوں کے خطوط اور قاصدوں کو اپنی آمد کا سبب نہ ٹھہراتے، بلکہ پھر تو یہ جواب ہوتا کہ میں اپنے آپ آیا ہوں اور خروج کے ارادے سے آیا ہوں---

③ اسی طرح دشمن کے سامنے اپنے شرائط کے طور پر یہ تین باتیں پیش کرنا اور ان میں اس بات کا بھی شامل ہونا کہ مجھے حجاز واپس جانے دو، ارادہ خروج کے منافی ہے۔ خروج کا عزم لے کر چلنے کے بعد واپسی پر

غور کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہو سکتا تھا---

④ سب سے واضح یہ بات ہے کہ آپ کوفہ کے سفر پر خواتین اور بچوں کی معیت میں روانہ ہوئے تھے۔ اگر آپ خروج کا موقف لے کر چلے ہوتے تو بچوں اور عورتوں کو ساتھ لے جانے کا کوئی موقع نہ تھا---

بہر کیف ان امور سے معلوم ہو جاتا ہے کہ کوفہ کا سفر، سفر خروج ہرگز نہ تھا۔ اب یہ بات باقی رہ جاتی ہے کہ آخر اس سفر کا مقصد کیا تھا؟---

پیچھے یہ گزرا ہے کہ حضرت امام رضی اللہ عنہ نے حالات پر غور و فکر کرنے کے بعد حکومت باطلہ کے خلاف حق کا کلمہ کہنے کا مسلک اختیار کیا تھا، لیکن اس دور میں کلمۂ حق کہنے والے کی زندگی اور سلامتی خطرے میں پڑ جاتی تھی۔ لہٰذا آپ کو کسی ایسے محفوظ مقام پر مقیم ہونا چاہیے تھا، جہاں آپ اپنا یہ فریضہ (جسے اس زمانے میں ادا کرنا، صرف آپ ہی کا کام تھا) بلا خطر ادا کرتے رہتے---

دوسری بات یہ تھی کہ گو ملکی سیاست پر نظر ڈالنے کے بعد آپ نے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ انقلاب کی کامیابی کی چنداں توقعات نہیں ہیں۔ چناں چہ آپ نے انقلاب و خروج کے پروگرام کو اپنا موقف نہیں بنایا تھا، تاہم مسلمانوں کے خیالات، جذبات اور جمہور امت کے رجحانات سے باخبر رہنا، آپ کے لیے نہایت ضروری تھا۔ کیوں کہ حکومت بہر حال غیر نمائندہ اور غیر اسلامی نوعیت کی تھی اور اس بات کے امکانات بعید نہ تھے کہ عامۃ المسلمین کسی وقت بھی اس جابرانہ اقتدار کا جوا گلے سے اتار پھینکنے کے لیے تیار ہو جائیں---

مختصر یہ کہ اگر چہ وقت کے بصیرت ورانہ مطالعے سے آپ ایک پر امن موقف پر چل رہے تھے مگر دوسری طرف سے یہ اندیشہ ستاتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ امت مسلمہ

مستقبل قریب یا بعید میں بااصول انقلاب کی خواہاں ہو، ان کی نگاہیں متبادل[۱] قیادت کی تلاش میں اٹھیں، لیکن وہ ملک میں صالح قیادت کا سراغ نہ پاتے ہوئے مایوس ہو کر خاموش ہو جائیں---

ان ساری باتوں کا حل یہ تھا کہ آپ کو ایک ایسی جگہ پر رہنا چاہیے تھا، جہاں آپ محفوظ بھی رہیں، جہاں آپ کلمہ حق بھی ادا کرتے رہیں اور جہاں آپ مسلمانوں کے انقلابی رجحانات کا جائزہ بھی لیتے رہیں اور یہ ساری باتیں بہ یک وقت کوفہ میں پائی جاتی تھیں۔ کوفہ ہی وہ مقام تھا، جہاں آپ کی حمایت کے دعوے دار سب علاقوں کی نسبت زیادہ تھے، لہٰذا آپ اپنے کو محفوظ بھی سمجھ سکتے تھے، اقتدار باطل کی بدعنوانیوں پر تنقید بھی کر سکتے تھے اور چوں کہ شامی مرکز کے خلاف مسلمانوں کی طرف سے اٹھنے والی کوئی آواز سب سے پہلے عراق[۲] ہی میں پیدا ہو سکتی تھی، لہٰذا یہاں آپ ملک کے انقلابی آثار و رجحانات کا مطالعہ آسانی سے کر سکتے تھے---

---

[۱]...... یہ صرف قیاسات نہیں بلکہ اس وقت کے مسلمانوں کے دلی جذبات کی ترجمانی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ شامی بازو کے علاوہ امت کا کوئی حصہ بھی یزید اور اس کے عمال کے اطوار کو پسند نہیں کرتا تھا اور سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے دلوں کی اس دھڑکن کو محسوس کرتے اور اس کے ساتھ ہی اپنی ذمہ داریوں سے بھی باخبر تھے۔ لیکن بایں ہمہ آپ کوئی ایسا قدم بھی نہیں اٹھانا چاہتے تھے کہ جو شریعت اور بصیرت کے خلاف ہو: ع

لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا

[۲]...... کیوں کہ یہ لوگ عہد علوی سے شامیوں کی نظر میں مغضوب و معتوب چلے آرہے تھے اور یہ قاعدہ ہے کہ حکومت کے خلاف زیادہ اضطراب ملک کے مظلوم حصے ہی میں پیدا ہوتا ہے، چناں چہ ایسا ہوا بھی کہ کوفیوں نے حضرت امام رضی اللہ عنہ کو خط لکھتے ہوئے اپنی مظلومی کا اظہار بھی کیا تھا لیکن پھر یہ ان کی بدبختی تھی کہ جب آپ ان کے پاس پہنچے تو وہ اپنے وعدوں سے پھر گئے---

کوفہ کی اس پوزیشن کے باوجود حضرت امام رضی اللہ عنہ اپنی طرف سے کوفہ کی جانب قدم بڑھانا نہ چاہتے تھے مگر جب کوفیوں کی طرف سے خطوط اور قاصدوں کا تانتا بندھ گیا تو آپ کے لیے سفر کوفہ ضروری ہو گیا---

اولاً اس لیے کہ کوفہ ہی میں آپ اپنی منصبی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکتے تھے، جو آپ امت کی طرف سے اپنے ذمے محسوس فرماتے تھے---

ثانیاً اس لیے کہ کوفیوں کی دعوت ظالم کے خلاف مظلوم کی پکار کی حیثیت رکھتی تھی اور انقلابی رجحانات کی طرف اشارہ کرنے والی پہلی چیز تھی، لہٰذا اسے مسترد کرنے کی کوئی وجہ موجود نہ تھی---

اس ساری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ سفر کوفہ، خروج کا سفر نہیں تھا، بلکہ وہ مظلومیت کی فریاد کرنے والوں کا جواب تھا اور امت کے جذبات و رجحانات معلوم کرنے کا ذریعہ تھا اور آپ نے اپنے ہر دو مقاصد کو ظاہر بھی فرما دیا تھا---

پہلی چیز کو آپ صاف الفاظ میں بیان فرماتے رہے، چناں چہ مکہ مکرمہ کے صحابہ کرام کے جواب میں آپ نے کوفیوں کی دعوت کا ذکر کیا، راستے میں عبداللہ بن مطیع کو بھی بتایا اور دشمن کے سامنے تقریر کرتے ہوئے بھی اس مقصد کا اعلان فرمایا---[۱]

دوسرے مقصد کو بھی آپ نے کہیں کہیں ظاہر فرما دیا تھا، لیکن اسے کسی قدر اشارے میں بیان کیا۔ جب عبداللہ بن جعفر نے راستے میں آ کر اصرار کیا کہ آپ مدینہ چلیں، تو آپ نے فرمایا تھا:

"مجھے نانا جان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خواب میں ایک حکم دیا ہے، میں اسے

[۱]...... مقام شراف پر دشمن کے لشکر کے سامنے کوفیوں کے خطوط کے دو تھیلے الٹ دیے گئے تھے---

پورا کروں گا، خواہ اس کا نتیجہ میرے موافق نکلے یا مخالف"---

[طبری، جلد ۷، صفحہ ۲۸۱]

اس خواب کو شہادت کا اشارہ نہیں سمجھنا چاہیے، کیوں کہ وہ ایک دوسرا خواب ہے جو آپ نے آگے چل کر آخری راتوں میں دیکھا تھا۔ اس خواب کے الفاظ کسی ایسے حکم کا ذکر کر رہے ہیں، جس کے انجام کے دو پہلو ہو سکتے ہیں اور اس کا اشارہ یقیناً مسلمانوں کے حالات سے باخبر رہنے اور اپنی ذمہ داریوں کے احساس کی طرف ہے، کیوں کہ اسی چیز کے دو نتیجے نکل سکتے ہیں۔ اسی طرح مقام عقبہ پر ایک شخص نے بڑی عاجزی سے عرض کی:

"میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں، آپ واپس لوٹ جائیے"---

مگر آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"جو تم کہتے ہو میں بھی جانتا ہوں، لیکن خدا کے حکم کے خلاف نہیں کیا جا سکتا"---[طبری، جلد ۷، صفحہ ۲۹۵]

دراصل اس قسم کے فقرے، اسی دوسرے مقصد کی طرف اشارہ کر رہے تھے---

کربلا میں حضرتِ شبیر رضی اللہ عنہ کی مظلومیت
اک حقیقت ہے، اسے تسلیم کرتے ہیں سبھی
لیکن اس سے بڑھ کے اس میں استقامت آپ کی
وجہِ بطلانِ فجور و ظلم حاکم بن گئی

[راجا رشید محمود]

چند دیگر سوالات

❶ ایک سوال یہ ہے کہ آپ بیوی بچوں کو ساتھ کیوں لے گئے؟---

اس کا جواب یہ ہے کہ جب آپ اپنے لیے کوفہ میں مقیم ہونا ضروری سمجھتے تھے تو اہل وعیال کو پیچھے کیسے چھوڑتے اور اسی سفر میں ساتھ لے جانے کا مقصد دشمن پر یہ ظاہر کرنا تھا کہ یہ کاروان، پرامن مقاصد کے ماتحت سفر کر رہا ہے، لہٰذا ان سے کسی کو کوئی خطرہ محسوس نہیں کرنا چاہیے---

❷ ایک دوسرا سوال یہ ہے کہ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آکر مشورہ دیا کہ کوفیوں پر اعتماد نہ کیجیے اور بعض مخلصین نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ پیش گوئی بھی

یاد دلائی تھی، جو آپ کی شہادت کے متعلق تھی، تو پھر آپ کوفہ جانا کیسے ضروری سمجھتے تھے---

اس کا جواب یہ ہے کہ شریعت کی بنیاد ظاہر پر ہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جو مشورہ دیا تھا، وہ ایک اندازہ تھا مگر حضرت امام رضی اللہ عنہ کے سامنے کوفیوں کے صدہا خطوط تھے، مگر یہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ واقعہ اسی سفر میں پیش آجائے گا---[۱]

شہادت مسلم کی خبر ملنے کے بعد؟

❸ تیسرا سوال یہ ہے کہ راستے میں آپ کو حضرت امام مسلم رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر مل گئی تھی، ظاہر ہے اس کے بعد کوفیوں کا طرز عمل واضح ہو چکا تھا کہ وہ اپنے وعدوں کو بالائے طاق رکھ چکے تھے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت امام رضی اللہ عنہ پھر بھی سلسلہ سفر جاری رکھتے ہیں۔ یہ سوال اس بحث کا اہم ترین سوال ہے، لہٰذا ہم اس پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالنا چاہتے ہیں---

واقعہ یوں ہے کہ جب آپ ثعلبہ کے مقام پر پہنچے تو بنو اسد کے ایک شخص نے یہ خبر سنائی۔ آپ نے انا للّٰہ و انا الیہ راجعون پڑھا، یہاں کچھ رفقاء نے عرض کی کہ اب واپس چلنا چاہیے۔ لیکن ساتھ ہی حضرت مسلم رضی اللہ عنہ کے بھائی اصرار کرنے لگے کہ ہم تو واپس نہیں جائیں گے، یا بھائی کا انتقام لیں گے اور یا پھر خود بھی شہید ہو جائیں گے۔

---

[۱]......صدر الافاضل حضرت مولانا محمد نعیم الدین مراد آبادی قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

"یہ یقین کرنے کی بھی کوئی وجہ نہ تھی کہ شہادت کا یہی وقت ہے اور اسی سفر میں یہ مرحلہ درپیش ہوگا"---[سوانح کربلا، صفحہ ۵۴]

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے اس پر فرمایا:

"تمہارے بعد ہماری زندگی میں کیا خیر ہوگی"---[کامل ابن اثیر]

اس کے ساتھ ہی بعض لوگوں نے کہا:

واللہ! آپ سے مسلم کا سا سلوک نہ کیا جائے گا، جونہی آپ کوفہ پہنچیں گے،

لوگ جوق در جوق آپ کی فوج میں آ کر شامل ہو جائیں گے---[۱]

ان باتوں کے علاوہ حضرت مسلم رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر جس نوعیت سے پہنچی تھی، وہ خود محلِ غور تھی۔ کیوں کہ تاریخوں میں اس چیز کے متعلق اختلاف ہے کہ یہ خبر کہاں ملی تھی؟--- پھر ایک مورخ لکھتا ہے کہ خبر لانے والے دو اسدی شخص تھے اور دوسرا مورخ لکھتا ہے کہ صرف ایک آدمی خبر لایا تھا۔ علاوہ ازیں یہ حقیقت بھی یاد رکھنی چاہیے کہ یہ بات بہت ہی بعید از گمان سمجھی جاتی تھی کہ خود حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو بھی شہید کر دیا جائے گا۔

آپ کی ایک تقریر کے جواب میں حر نے کہا تھا:

"میں آپ کو خدا کی یاد دلاتا ہوں اور گواہی دیتا ہوں کہ اگر آپ نے جنگ کی، تو آپ قتل کر دیے جائیں گے"---

اس پر آپ نے خود ازراہِ تعجب فرمایا تھا:

"تم مجھے موت سے ڈراتے ہو، کیا تمہاری شقاوت اس حد تک پہنچ جائے گی کہ مجھے قتل کر دو گے"---[ابن اثیر، جلد ۴]

اور دراصل حر کا بھی ذاتی خیال یہی تھا کہ آپ کے قتل تک نوبت ہرگز نہ پہنچے گی۔ اس وقت اس نے حکومت کی پالیسی کے مطابق آپ کو دھمکی سنا دی تھی، کیوں کہ دس محرم کو جب یہی حضرت حر رضی اللہ عنہ تائب ہونے کے لیے حاضرِ خدمت ہوئے تھے، تو

[۱]...... "الحسین" نے اس قول کو صفحہ ۹۴ پر نقل کیا ہے---

خود انھوں نے کہا تھا:

''میں ہی وہ بدنصیب ہوں جس نے آپ کو سب سے پہلے روکا اور یہاں تک لانے کا باعث بھی میں ہی بنا۔ لیکن خدا کی قسم یہ بات میرے گمان میں بھی نہ تھی کہ ان لوگوں کا سلوک آپ سے اس حد تک پہنچ جائے گا''---[طبری، جلد ۷ صفحہ ۳۳۰/ ابن اثیر، جلد ۴]

پھر جن راہوں میں سے آپ سفر کر رہے تھے، ان میں جا بجا ابن زیاد کی پولیس متعین تھی اور جاسوس اپنے فرائض سر انجام دے رہے تھے۔ وہ آپ کے اور اہل کوفہ کے درمیان اس طرح حائل تھے کہ کوئی خبر یا کوئی پیغام اِدھر سے اُدھر ان کی نظروں سے بچ کر آ جا نہیں سکتا تھا۔ حتیٰ کہ حضرت امام رضی اللہ عنہ نے حضرت مسلم رضی اللہ عنہ کی طرف راستے سے جو دو قاصد روانہ کیے تھے، ان کو ابن زیاد کی اسی پولیس نے گرفتار کر کے ابن زیاد کے پاس کوفہ بھیج دیا تھا، جہاں انہیں بے دردی کے ساتھ قتل کر دیا گیا۔ اب ظاہر ہے کہ ان حالات میں کسی خبر یا کسی پیغام پر کیا اعتماد کیا جا سکتا تھا اور اس ناکہ بندی کی حالت میں ایک دو آدمیوں کی خبر پر آپ اپنا فیصلہ کس طرح بدل سکتے تھے---[۱]

شہادت تک نوبت کیسے پہنچی؟

❹ چوتھا سوال یہ ہے کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے پر امن موقف

[۱]......گو فی الواقع حضرت مسلم رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر درست تھی، لیکن آپ تک جن حالات میں اور جن ذرائع سے یہ خبر پہنچی تھی، ان کے پیشِ نظر تو یہ شبہ بھی کیا جا سکتا تھا کہ شاید ابن زیاد کے آدمیوں نے یہ خبر ویسے ہی مشہور کر دی ہوتا کہ آپ دہشت زدہ ہو کر واپس چلے جائیں اور کوفہ تک پہنچنے کی کوشش نہ کریں---

اور اپنے بے ضرر طرزِ عمل کی، اپنے اقوال وافعال سے وضاحت کر دی تھی۔
آپ نے راستے کی منزلوں پر جگہ جگہ اپنی تقریروں میں آنے کی
وجہ بیان کی تھی۔ پھر عملی طور پر بھی آپ نے امن کا طریق عمل پیش کیا تھا،
جب آپ کا قافلہ قصر بنی مقاتل سے آگے نکلا تو حر کو ابن زیاد کا حکم آیا:

"ان کو پانی سے دور چٹیل میدان میں روک دو"---

حر نے آپ کو اس حکم کی تعمیل کے لیے مجبور کرنا چاہا، اس موقعہ پر آپ کے ایک ساتھی
زہیر بن قین رضی اللہ عنہ نے عرض کی:

"اے فرزند رسول (رضی اللہ تعالیٰ عنک)! آئندہ جو وقت آئے گا،
وہ اس سے بھی زیادہ سخت آئے گا، ابھی لڑنا آسان ہے۔ اس دستے کے بعد
جو فوجیں آئیں گی، ہم ان کا مقابلہ نہ کر سکیں گے"---

اس پر آپ کا جواب یہ تھا:

"میں اپنی طرف سے لڑائی کی ابتدا نہ کروں گا"---

[کامل ابن اثیر، جلد ۲، صفحہ ۴۳-۴۴]

اسی طرح، طرماح بن عدی نے کہا تھا:

"آپ ہمارے ساتھ چل کر ہمارے پہاڑ کے دامن میں قیام کیجیے،
خدا کی قسم یہ پہاڑ ایسا ہے کہ ہم نے نعمان بن منذر اور غسان وحمیر کے
بادشاہوں کو اس کے ذریعے روکا ہے.......... اگر وہاں کوئی خطرہ پیش آیا تو
قبیلہ بنی طے کے بیس ہزار جوان آپ کے سامنے اپنی تلواروں کے جوہر
دکھائیں گے"---

آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"خدا تعالیٰ تمہیں اور تمہاری قوم کو جزائے خیر دے، دراصل ہم میں اور ان لوگوں میں عہد ہو چکا ہے، جس کی رو سے ہم لوٹ نہیں سکتے اور ہم کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ہمارا اور ان کا معاملہ کیا صورت اختیار کرے گا"---

[ابن اثیر، جلد ۴]

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے قول اور فعل سے یہ بات بالکل واضح کر دی تھی کہ آپ کسی جنگی مقصد سے نہیں جا رہے، حتیٰ کہ دشمن آپ کو نرغے میں لیتا جا رہا تھا اور آپ کی واپسی کی تمام راہیں بند کی جا رہی تھیں۔ تاہم آپ مدافعت کے لیے بھی کوئی قدم نہیں اٹھاتے، اس سے بڑھ کر بے ضرر اور باامن روش کیا ہو سکتی تھی؟---

لیکن ہم پھر بھی دیکھتے ہیں کہ آپ کے ساتھ حد درجہ ناانصافی کی گئی، معقولیت اور انسانیت کی تمام باتیں بھلا دی گئیں، آخر اس کا باعث کیا تھا اور ان لوگوں کے دماغوں میں کیا بھرا ہوا تھا؟---

اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ یہ سب دنیا کی حرص اور اقتدار کے لالچ کے کرشمے تھے---

اور مفصل جواب یہ ہے کہ یزید کے حالات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے تخت پر قدم رکھتے ہی اپنے اقتدار کو مضبوط بنانے کی ایک سکیم بنائی اور اس کو نافذ کرنے کے لیے ہر جائز و ناجائز قدم اٹھانے کا تہیہ کر لیا، اس نے نظر دوڑا کر دیکھا کہ کون شخص اقتدار کی راہ میں رکاوٹ بن سکتا ہے، اس سلسلے میں اس کو حضرت امام رضی اللہ عنہ کی ذات سب سے زیادہ کھٹکی، چناں چہ اس نے عامل مدینہ ولید کو لکھا:

اما بعد فخذ حسینا و عبد اللہ بن عمر و ابن الزبیر بالبیعۃ اخذا لیس فیہ رخصۃ والسلام ---[ابن اثیر، جلد ۴، صفحہ ۶]

"تم حسین، عبداللہ بن عمر اور ابن زبیر رضی اللہ عنہم سے بیعت لو اور ایسی گرفت کرو، جس میں کوئی رعایت نہ ہو"---

اس حکم نامے میں سرفہرست حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ ہی کا نام ہے---[۱]

حاکم مدینہ چوں کہ بیعت لینے میں ناکام رہا اور جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ مکہ چلے آئے، تو یزید نے ابن زیاد کو لکھا:

قد بلغنی ان الحسین توجه نحو العراق فضع المراصد و المسالح و احترس و اجس علی التهمة و خذ علی الظنة غیر ان لا تقتل الا من قاتلك---[ابن اثیر، صفحہ ۱۸]

"مجھے خبر ملی ہے کہ حسین عراق کی طرف روانہ ہو چکے ہیں، پس تم مورچے اور ہتھیار سنبھالو، جاسوسوں کا سلسلہ قائم کرو اور جس پر شک پڑے، اسے گرفتار کرو۔ مگر یہ کہ قتال اسی سے کرنا جو تم سے قتال کرے"---

ان حکم ناموں سے یزید کی روش کا اندازہ ہوتا ہے۔

یہاں پر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یزید، ابن زیاد سے کچھ ناراض تھا، لیکن جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا معاملہ سامنے آیا، تو اس نے اپنی ناراضگی نظر انداز کرتے ہوئے، اسی ابن زیاد کو بصرہ کے ساتھ کوفہ کا والی بھی مقرر کر دیا، کیوں کہ یزید کے مشیروں نے اسے مشورہ دیا تھا کہ ابن زیاد کے سوا اور کوئی شخص اس معاملے کو نپٹا نہیں سکے گا---

---

[۱]......حالاں کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی وصیت یہ تھی:

"حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے معاملے میں درگزر سے کام لینا، کیوں کہ وہ قرابت دار، بڑے حق دار اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عزیز ہیں"---

[طبری، جلد ۷، صفحہ ۱۹۷]

یہاں تک وہ کردار ہے، جو یزید نے ادا کیا۔ اس کے بعد پھر جو کچھ ظہور میں آیا، وہ ابن زیاد اور اس کے ماتحت حاکموں کا حصہ تھا---

ابن زیاد بڑا تند مزاج، بڑا عیار، بڑا خوف ناک اور خون خوار قسم کا شخص تھا۔ جب وہ بصرہ سے روانہ ہونے لگا تو اچانک اسے خبر ملی کہ بصرہ میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا خط آیا ہوا ہے اور اس کا جواب لے کر ایک قاصد روانہ ہونے والا ہے۔ اس نے اس قاصد کو گرفتار کر کے سولی پر چڑھا دیا اور بصرہ والوں کو گرج کر کہا:

"اگر تم نے حسین رضی اللہ عنہ کی حمایت میں کوئی قدم اٹھایا، تو میں ہر ایسے شخص کو قتل کر دوں گا اور اس کے محلے کے شیخ کو بھی قتل کروں گا"---

اس کے بعد وہ کوفہ چلا گیا۔ کوفہ میں ہزاروں آدمی حضرت مسلم رضی اللہ عنہ کے گرد جمع تھے، لیکن اس نے دھمکیوں اور رشوتوں سے حالات پر قابو پا لیا۔ پھر اس نے حضرت مسلم رضی اللہ عنہ اور ان کے پناہ دینے والوں کو بھی قتل کرا دیا---

عبداللہ بن یقطر اور قیس بن مسہر وہ قاصد تھے، جو حضرت امام رضی اللہ عنہ نے رستے سے حضرت مسلم رضی اللہ عنہ کی طرف بھیجے تھے۔ ابن زیاد نے انہیں بھی گرفتار کر کے محل کی چھت پر سے قتل کرا کے پھینکوا دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص لوگوں کے قتل اور انسانی جانوں کے ضائع کرنے سے خوش ہوتا تھا۔ یہ تھا اس شخص کا مزاج، جس کے ہاتھ میں سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کا معاملہ تھا۔ ابن سعد اس قدر لالچی اور بندۂ دنیا تھا کہ ابن زیاد نے اسے بلا کر کربلا کی کمان سنبھالنے کے لیے کہا تو پہلے کہنے لگا:

"یا امیر! یہ ابن رسول کا معاملہ ہے، کسی اور کے سپرد کیجیے"---

لیکن جب ابن زیاد نے کہا:

"پھر "ری" کی حکومت بھی چھوڑنا ہوگی"---

تو آمادہ ہوگیا اور یہی وہ شقی تھا، جس نے میدان کربلا میں پہلا تیر چلا کر کہا تھا:

"گواہ رہنا جنگ کا آغاز میں نے کیا ہے"---

اور یہ نمائش بھی ابنِ زیاد کو خوش کرنے کے لیے تھی۔ یہ وہ شخص تھا، جس کے ہاتھ میں کوفی فوجوں کی کمان تھی---

تیسرا نام شمر کا ہے۔ اس کی سخت دلی کا یہ عالم تھا کہ جب عمرو بن سعد نے ابن زیاد کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی تین شرطیں [۱] لکھ کر بھیجیں تو ابن زیاد کہنے لگا:

"ہم ان کو قبول کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں دیکھتے"---

لیکن یہ شمر تھا، جس نے کہا:

"اے امیر! حسین رضی اللہ عنہ اس وقت قابو میں ہیں اور چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اگر اب وہ نکل گئے، تو پھر کبھی قابو نہ آئیں گے"---

یہ بات ابن زیاد کے ذہن پر بیٹھ گئی اور اس نے عمرو بن سعد کے نام نہایت سخت احکامات جاری کیے۔ یہ شمر میدان کربلا میں فوج کے ایک حصے کا نگران تھا، یہی وہ لوگ تھے جو کربلا میں بربریت کا ڈرامہ کھیل رہے تھے---

کوفی بھی اس کھیل میں برابر کے شریک ہوگئے تھے اور ان کا رویہ نہایت تعجب ناک طریقے سے بدلا۔ چند دن پیشتر وہ حضرت سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کی حمایت کی قسمیں کھاتے تھے، اپنے دستخط اور حلف ڈال ڈال کر ان کو خط لکھتے تھے۔ لیکن پھر انہی لوگوں کی تلواریں، آلِ علی رضی اللہ عنہ کے خیموں کے آس پاس چمکتی نظر آئیں۔ پہلے وہ

---

[۱]...... ۱ سرحدوں پر جانا---
۲ حجاز واپس جانا---
۳ یزید کے پاس گفتگو کے لیے پہنچنا---

ہزار در ہزار جمع ہو کر حضرت امام مسلم رضی اللہ عنہ کے ساتھ ابن زیاد کے محل کا محاصرہ کیے کھڑے تھے اور پھر چند لمحوں کے بعد وہ لوگ امام مسلم رضی اللہ عنہ کو ان کی پناہ گاہ سے پکڑ کر قتل کرنے کے لیے ابن زیاد کے سپرد کر گئے---

غدر و خیانت کی کیسی عجیب داستان ہے کہ میدان میں شمشیر بکف کوفیوں کو سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ خطاب کرتے ہیں:

''اے شیث بن ربعی، اے حجار بن الجبر، اے قیس بن اشعث، اے یزید بن حارث! کیا تم نے مجھ کو نہیں لکھا تھا، پھل پک چکے ہیں، کھجوریں سر سبز ہیں، دریا جوش میں ہیں اور فوجیں تیار ہیں، تم فوراً آؤ''---

لیکن وہ جواب دیتے ہیں:

''ہم نے نہیں لکھا تھا''---

اس پر حضرت نے قسم کھائی اور فرمایا:

''خدا کی قسم! تم نے لکھا تھا''---

زہیر بن قین (ایک حسینی سپاہی) نے ان کوفیوں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا:

''خدا نے ہم کو اور تم کو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذرّیت کے بارے میں آزمائش میں مبتلا کیا ہے کہ ہم ان کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں، میں تم کو ان کی امداد اور ابن زیاد کی رفاقت ترک کرنے کی دعوت دیتا ہوں''---

اس پر کوفیوں نے زہیر کو گالیاں دیں اور ابن زیاد کی تعریف کے قصیدے پڑھے۔ اور پھر کہنے لگے:

''خدا کی قسم! ہم حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کو قتل یا انہیں گرفتار کر کے امیر ابن زیاد کے پاس ضرور پہنچائیں گے اور اس کے بغیر

ٹل نہیں سکتے“---

ان باتوں سے کوفیوں کی غدارانہ سرشت کا بخوبی علم ہو جاتا ہے اور یہ سب کچھ دھمکی اور لالچ کی کرشمہ سازی تھی۔ ابن زیاد سے لے کر ہر کوفی سپاہی تک، سب کے سب انسانی کردار سے عاری اور شرافت و مروت سے خالی دکھائی دے رہے تھے---

ان لوگوں کو اس بات سے غرض نہ تھی کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی کس پوزیشن میں تھے۔ کن مقاصد کے ماتحت آئے تھے اور وہ کیا چاہتے تھے۔ البتہ یہ لوگ اتنا جانتے تھے کہ اب حسین رضی اللہ عنہ گرفت میں ہیں، ایسا نہ ہو کہ وہ بچ کر نکل جائیں۔ چناں چہ ان چند کارروائیوں کے لیے عراق کی تمام فوج اور پولیس حرکت میں آ گئی تھی۔ ابن اثیر لکھتا ہے:

”سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے مکہ سے کوچ کی خبریں سن کر ابن زیاد نے قادسیہ سے خفان اور خفان سے قطقطانہ اور وہاں سے جبل لعلع تک گھوڑ اسوار مقرر کر دیے“---

ایک دوسرا مورخ بتلاتا ہے کہ قادسیہ سے عذیب تک سواروں کا جال بچھا دیا گیا تھا تاکہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ بچ کر نہ جا سکیں۔ نیز کوفہ سے حجاز کی طرف جانے والے ہر راستے کی ناکہ بندی کر لی گئی تھی۔ حصین بن نمیر (کوفی پولیس کا بڑا افسر) کو ان تمام انتظامات پر کڑی نگرانی رکھنے کا حکم دیا گیا تھا اور حجاز و کوفہ کے درمیان حکومت کے جاسوس پھیل چکے تھے۔ ان انتظامات کا مقصد یہ تھا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی کسی علاقے سے ڈاک جاری نہ رہ سکے اور نہ ہی قاصد آ جا سکیں۔ چناں چہ آپ کے دو قاصد پکڑ کر قتل کر دیے گئے تھے---

اس ناکہ بندی کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نہ کوفہ پہنچ سکیں اور

نہ واپس جاسکیں اور نہ کہیں اِدھر اُدھر بچ کر نکل سکیں، چناں چہ حضرت حر رضی اللہ عنہ نے حضرت امام رضی اللہ عنہ کی حمایت میں آنے کے بعد اپنی تقریر میں کہا تھا:

''اے اہل کوفہ! پہلے تم نے حسین رضی اللہ عنہ کو بلایا، جب وہ آ گئے تو تم نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ پہلے یہ زعم رکھتے تھے کہ ان کی حمایت میں لڑو گے، پھر ان کے مخالف ہو گئے اور اب ان کے قتل کی فکر میں ہو۔ تم نے انہیں ہر طرف سے گھیر لیا ہے اور خدا کی وسیع زمین میں کسی طرف ان کو جانے نہیں دیتے کہ وہ اور ان کے اہل بیت کسی پر امن مقام پر چلے جائیں اور اس وقت ان کی حالت بالکل قیدی کی سی ہو چکی ہے'' ---[طبری وابن اثیر]

حقیقت یہ ہے کہ یہ محاصرہ اور یہ ناکہ بندی آپ کے مکہ سے روانہ ہونے سے چند دن بعد ہی عمل میں آ چکی تھی کیوں کہ ابن زیاد یہ تہیہ کیے ہوئے تھا کہ اس موقع سے پورا فائدہ اٹھانا ہے اور حسین رضی اللہ عنہ کو بچ کر نہیں جانا ہے---

لہٰذا ان حالات میں یہ بات تلاش کرنا عبث ہے کہ آپ کے پر امن طریق کار اور محتاط طرز عمل کے باوجود معاملہ کی نوبت شہادت تک کیسے پہنچ گئی۔ کیوں کہ جب ڈاکوؤں کا ایک گروہ کسی قافلے کو غارت کرنے کا فیصلہ کر لے تو قافلے والوں کی امن پسندی حملہ آور کی خون خواری میں فرق نہیں ڈال سکتی---

پس اس عدیم النظیر تاریخی معرکے میں دیکھنے کی بات یہ نہیں کہ تلواریں، تلواروں سے کس طرح کھٹکھٹائیں اور تیر و تبر آپس میں کس طرح ٹکرائے، بلکہ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ انسانیت اور حیوانیت کی اس کش مکش میں، حیوانوں کے افعال کیا تھے اور انسانوں کا کردار کیا تھا؟---

ہم فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نواسے، حضرت

سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کو عظیم جرأت، بلند ہمت، عالی حوصلہ، حیرت انگیز استقلال اور بے نظیر صبر وثبات عالیہ کی صفات عطا کی تھیں---

۲۷ ر رجب سے لے کر ۱۰ محرم تک آپ کا ہر قدم، شریعت اور مومنانہ بصیرت کی حدود کے مطابق اٹھتا چلا آیا۔ لیکن جب اتمام حجت کی ہر آخری سے آخری صورت پر عمل کرنے کے باوجود مخالف کی بدبختی میں فرق نہ آیا اور اس وقت بھی جب کسی نے پکار کر بتلایا کہ نجات کی راہ صرف اور صرف یزید کی بیعت ہے۔ مگر آپ کا قال وحال بلکہ روح کی گہرائیاں، جواب دے رہی تھیں کہ اس ذلت کی توقع ہم سے نہ رکھو۔ پھر اس جواب کی جو سزا، وقت کے جھوٹے والی دے سکے، دیتے رہے اور وقت کا سچا شہنشاہ، اسے برداشت کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے فرات کے کنارے پر دریا کے پانی کی بجائے، چشمہ شہادت کا پانی پی لیا:

در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست
ہم چو مرداں ، جان سپردن زندگی است
[ٹیپو شہید]

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے صبر وثبات اور ان کے نانا صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت وعظمت پر ابد الاباد تک بے حد وحساب درود وسلام ہوں اور ہمیں ان کی سچی پیروی کی سعادتیں نصیب ہوں۔

آمین یا رب العلمین---

شاہ است حسین بادشاہ ست حسین
دین ست حسین دین پناہ ست حسین
سر داد نہ داد دست در دست یزید
حقا کہ بنائے لا الٰہ ست حسین

[خواجہ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ]

شہداء کی یاد منانے کا طریقہ

رمز قرآن از حسین آموختیم
زِ آتش او شعلہ ہا اندوختیم

[علامہ اقبال]

شہید کی محبت

شہید حق و صداقت کے نام پر اپنی جان قربان کرتا ہے، اس لیے ملت اس کی قربانی کو محبت واحترام کی نگاہوں سے دیکھتی ہے اور ہر دل میں اس کی محبت کا چراغ فروزاں رہتا ہے۔ سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے صابر ساتھیوں کا تذکرہ لبوں پر آتے ہی کون سی آنکھ ہے، جو محبت کے آنسوؤں سے تر نہیں ہوتی اور کون سا دل ہے، جو عشق کی روشنی سے جگمگا نہیں اٹھتا---

یاد منانا

محبت کے مختلف تقاضوں میں سے ایک تقاضا، محبوب کا ذکر کرنا اور اس کی یاد کو

زندہ رکھنا بھی ہے۔ ہر طالب اپنے مطلوب کی باتوں میں مگن رہتا ہے اور ہر چاہنے والا اپنے محبوب کی یاد کو دنیا میں زندۂ جاوید بنانا چاہتا ہے۔ دنیا کی تمام قومیں اپنی تاریخ کے بڑے لوگوں کی یاد منانے کے لیے جو مختلف طریقے اختیار کرتی ہیں، ان سب میں یہی جذبہ کارفرما ہوتا ہے---

مسلمان بھی اپنی ملی تاریخ کے عظیم انسانوں کی محبت کو اپنے لیے سرمایہ حیات سمجھتا ہے اور ان کی یادگاروں کو عالم میں زندہ و پائندہ رکھتا ہے، جیسا کہ محبت کا تقاضا ہے۔ لیکن جس طرح زندگی کے دوسرے مسائل میں مسلمان باقی قوموں سے الگ ہے، اسی طرح اس مسئلے میں بھی وہ دوسروں سے بالکل ممتاز نظر آتا ہے کیوں کہ مسلمان اپنے پاس ایک مستقل اور مکمل نظریہ حیات رکھتا ہے، لہٰذا اس کی زندگی کا ہر گوشہ اسی نظریہ حیات کی کرنوں سے منور ہوتا ہے---

چناں چہ مسلمان گو اپنے اسلاف سے محبت رکھتا ہے لیکن اس کی محبت کا وہ تصور نہیں جو جاہل قوموں میں پایا جاتا ہے۔ اسی طرح وہ اسلاف کی یاد مناتا اور ان کی یادگاروں کو باقی رکھتا ہے، لیکن اس کے طریقے وہ نہیں ہوتے جن کو جہلائے روزگار پسند کیا کرتے ہیں، مثلاً یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنے انبیاء کو غلط قسم کی محبت کے جوش میں آ کر خدا کہہ دیا اور کبھی خدا کا بیٹا بنا دیا۔ قرآن حکیم نے اس محبت کو سراسر غلط اور ایسی محبت کے قائلین کو مجرم قرار دیا:

لَقَدْ کَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ ---[المائدۃ:۷۲]

"ان لوگوں نے کفر کیا جنہوں نے کہا کہ اللہ، مسیح بن مریم ہے"---

لَقَدْ کَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰہَ ثَالِثُ ثَلٰثَۃٍ---[المائدۃ:۷۳]

"ان لوگوں نے کفر کیا جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں تیسرا ہے"---

وَ قَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرُنِ ابْنُ اللّٰهِ وَ قَالَتِ النَّصٰرٰى الْمَسِيحُ ابْنُ اللّٰهِ---[التوبة:۳۰]

"یہودیوں نے کہا کہ عزیر اللہ کے بیٹے ہیں اور عیسائیوں نے کہا کہ مسیح اللہ کے بیٹے ہیں"---

قرآن محبت کے اس تصور کو اس لیے تسلیم نہیں کرتا کہ اس سے اصل مقاصد حاصل نہیں ہوتے بلکہ دین حق کا پیش کردہ نظریہ زندگی ہی درہم برہم ہوجاتا ہے--- یہی یہود و نصاریٰ انبیاء کے ساتھ محبت کے اس غلط تصور کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ ہم سب اللہ کے پیارے اور اس کے فرزند ہیں۔ لہٰذا ہمیں آخرت کی فکر سے کیا غرض؟---[۱]

وَ قَالَتِ الْيَهُودُ وَ النَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ---[المائدہ:۱۸]

"یہودیوں اور عیسائیوں نے کہا کہ ہم تو اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں"---

اور سورۂ بقرہ میں ان کا یہ دعویٰ مذکور ہوا کہ:

وَ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً---[البقرہ:۸۰]

"اور وہ کہتے ہیں کہ ہمیں آگ نہ چھوئے گی سوا چند دنوں کے"---

[۱]......عیسائیوں کا تو صاف عقیدہ ہی یہ ہے کہ حضرت مسیح سولی پر چڑھ کر اپنی امت کے گناہوں کی بخشش کرا گئے ہیں---

آپ نے غور کیا کہ محبت کی ذرا سی لغزش انسانوں کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے---[۱] اب یہ یہودی اور عیسائی انبیاء کو خدا کا بیٹا پکار پکار کر اپنے زعم میں یہ سمجھے ہوں گے کہ ہم ان کی خوشنودی اور رضا حاصل کر رہے ہیں، لیکن درحقیقت ان انبیائے کرام کی ارواح مقدسہ ان کے جاہلانہ و ظالمانہ تصورات سے بیزار ہیں اور قیامت کے دن ان کی یہ جاہلانہ محبت ان کے منہ پر دے ماری جائے گی---

لہٰذا اسلاف (خواہ شہید ہوں، خواہ اللہ کے دوسرے نیک بندے) سے محبت رکھنے اور ان کی یاد منانے کا اسلامی طریقہ وہی ہو سکتا ہے، جو قرآن حکیم کی ہدایت کے مطابق ہو۔ قرآن حکیم بہت سے انبیائے کرام اور صالحین کی زندگیاں اور ان کی قوموں کے حالات بیان فرماتا ہے۔ مگر ان میں سے صرف وہی چیزیں سامنے لاتا ہے، جن کا تعلق ان انبیاء کی تعلیمات، ان کے اعلیٰ اخلاق اور پاکیزہ اعمال کے ساتھ ہوتا ہے اور اس کے بعد تمام جغرافیائی اور تاریخی یا محض ظاہری اور رسمی قسم کی چیزوں کو چھوڑ دیتا ہے---

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ محبت کے لائق ان کی سیرت اور ان کی پاکیزگی ہے اور یاد رکھنے اور ذکر کرنے کے قابل ان کے اصول اور ان کی تعلیمات ہیں۔ قرآن حکیم نے شہداء کا ذکر بھی کیا ہے اور ان کی یاد منانے کا اصول بھی بیان فرمایا ہے، چوں کہ ہمارا اصل مقصد یہی ہے کہ شہداء کی یاد منانے کا اسلامی طریقہ معلوم کیا جائے، اس لیے یہ مسئلہ پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آنا چاہیے---

---

[۱]...... جب محبت کا تصور غلط ہو گیا تو یاد باقی رکھنے کا طریقہ خود بخود غلط اور جاہلانہ ہو کر رہ گیا۔ یعنی یہ قومیں انبیاء کی مورتیاں اور مجسمے بنا کر ان کی پوجا میں مصروف ہو گئیں، اسلام نے اسی لیے تصویر بنانے سے منع کر دیا کہ کہیں مسلمان قوم بھی انبیاء و صلحاء کی تصویریں اور شبیہیں بنا بنا کر ان کی عبادت نہ شروع کر دیں۔ اسلام نے اسلاف کی یاد منانے کے لیے وہ طریقے دیے ہیں، جن سے ان نیک بندوں کی سیرت، ان کی تعلیمات اور ان کا مشن زندہ ہو، نہ کہ ایسی رسمیں جو انسان کو شرک اور جہالت کے غار میں گرا دیں---

یادِ شہداء اور قرآن

قرآن حکیم نے سورۂ بقرہ میں شہداء کا ذکر اس طرح فرمایا ہے:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ م بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ---[البقرہ:۱۵۴]

''اور جو اللہ کی راہ میں قتل ہوں ان کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں، لیکن تم نہیں جانتے''---

شہادت کا ایک رخ یہ ہے کہ وہ شہید کے لیے اور اس کی قوم کے لیے ایک غیر فانی اعزاز ہے---

اور دوسرا رخ یہ ہے کہ شہید کے پس ماندگان کے لیے یہ رنج والم اور گہرے حزن وملال کا موقع بھی ہے۔ وہ بیبیاں جن کے شوہر شہید ہو جائیں، وہ بیٹے جن کے باپ اللہ کی راہ میں کام آ جائیں اور وہ باپ جن کے فرزند دشمن کی تلوار کا نشانہ بن جائیں، کس قدر دکھتے، سسکتے اور آہیں بھرتے ہیں۔ لیکن قرآن حکیم اس موقعہ پر مردِ مومن کے لیے ایک نرالا کردار بتلاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں تمہیں مال، پیداوار، جان اور اولاد غرضے کہ ہر پیاری چیز سے آزمایا جاتا ہے اور آزمایا جائے گا، لیکن تم نے صبر واستقلال کا اعلیٰ نمونہ پیش کرنا ہوگا---

چناں چہ شہداء کے ذکر کے بعد ساتھ ہی دوسری آیت میں فرمایا:

وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ط وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ o اَلَّذِیْنَ اِذَا اَصَابَتْھُمْ مُّصِیْبَۃٌ قَالُوْا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ

رٰجِعُوْنَ○---[البقرہ،۱۵۱-۱۵۲]

''اور ہم تمہیں خوف، قحط، جان و مال اور پیداوار کے نقصان سے ضرور آزمائیں گے اور صبر کرنے والوں کو بشارت سنا دو، جو مصیبت کے وقت کہتے ہیں، بے شک ہم اللہ کے ہیں اور ہم نے اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے''---

ان آیات سے صاف معلوم ہوا کہ جس قوم کے کچھ افراد اللہ کی راہ میں شہید ہو جائیں یا اسی طرح کوئی دوسری آزمائش آ جائے تو انہیں صبر و رضا کا نہایت اعلیٰ کردار پیش کرنا چاہیے۔ شہداء کے پس ماندگان کو یہ بات کبھی زیب نہیں دیتی کہ وہ اللہ کی راہ میں جان دینے والوں کی لاشوں پر جاہلانہ انداز کی آہ و فغاں بلند کریں---

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ جب جنگ صفین سے واپس لوٹے تو شہر کی گلیوں سے کچھ عورتوں کی آواز سنائی دی، جو میدان جنگ کے مقتولین پر بین کر رہی تھیں، تو آپ نے اس وقت ارشاد فرمایا[۱]:

أَتَغْلِبُكُمْ نِسَاءُكُمْ عَلٰى مَا اَسْمَعُ اَلَا تَنْهَوْنَهُنَّ عَنْ هٰذَا الرَّنِيْنِ؟---[نہج البلاغہ، صفحہ۱۲۲۹، مطبوعہ تہران]

''کیا تمہاری عورتیں تمہارے قابو میں نہیں، یہ میں کیا سن رہا ہوں،

[۱]...... اسلام میں یہ اصول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت قائم فرمایا تھا، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم جنگ احد سے فارغ ہو کر مدینہ طیبہ میں داخل ہوئے اور عربوں کے دستور کے مطابق بین کرنے والی عورتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر جمع ہو گئیں۔ جب ان کے رونے پیٹنے کی آواز حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم باہر نکلے اور فرمایا:

''بس تمہارا شکریہ اسلام میں نوحہ کرنا منع کیا گیا ہے''---

اسی واقعہ کا دوسرا حیرت انگیز حصہ یہ ہے کہ جب بھائی کی شہادت کی خبر سن کر حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا میدان میں پہنچیں اور بھائی کی کٹی ہوئی لاش کو دیکھا، تو شہیدوں کے سردار کی شیر دل بہن کے منہ سے بس اتنا نکلا: انا للہ و انا الیہ رٰجعون---

واقعی بندۂ مومن کا مقام صبر ایسی ہی شان دکھاتا ہے---

کیا تم انہیں اس رونے پیٹنے سے منع نہیں کرتے"---

شہید، جو اعلیٰ قسم کا قومی کردار ادا کر کے دنیا سے رخصت ہوتا ہے، اس کردار کے ایک حصے کی تکمیل پس ماندگان کے طرزِ عمل پر موقوف ہوتی ہے اور وہ یہی ہے کہ جن کا کوئی عزیز خدا کی راہ میں خنجرِ ستم سے ذبح کیا گیا ہو، وہ اس کی غم انگیز یاد میں اسی صبر و ثبات کا راستہ اختیار کریں، جس کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود شہید مغفور دنیا سے روانہ ہوا---

جو لوگ اس کی راہ پر چلتے ہیں، وہی حقیقت میں شہید کے مشن کو سمجھتے ہیں۔ لہٰذا وہ اللہ کے ہاں اپنے طرزِ عمل کا ثواب پائیں گے، جیسا کہ حضرت علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک ساتھی سے فرمایا تھا:

يَا اَشْعَثُ ! اِنْ صَبَرْتَ جَرٰى عَلَيْكَ الْقَدْرُ وَ اَنْتَ مَاجُوْرٌ---[نہج البلاغۃ، صفحہ ۱۲۱۷]

"اے اشعث! اگر تم صابر رہو تو تم پر تقدیر اس حالت میں گزرے گی کہ تم ثواب پانے والے ہو گے"---

لیکن جو لوگ صبر و ثبات کا دامن چھوڑتے ہیں، وہ نہ شہید کے نصب العین کو سمجھتے ہیں اور نہ اس کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں، لہٰذا وہ اجر و ثواب سے محروم رہتے ہیں۔ حضرت سیدنا علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ نے فرمایا[۱]:

وَ مَنْ ضَرَبَ عَلٰى فَخِذِهٖ عِنْدَ مُصِيْبَةٍ حَبِطَ اَجْرُهٗ---

[نہج البلاغۃ، صفحہ ۱۱۴۳]

"اور جو شخص مصیبت کے وقت اپنی ران پر ہاتھ مارتا ہے، اس کا ثواب ضائع ہو جاتا ہے"---

[۱]......اور آپ کا یہ فرمان حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث مبارک سے مستفاد ہے، جس میں فرمایا: "جس نے گریبان پھاڑا، چہرہ پیٹا اور جہالت کی باتیں کیں وہ ہم میں سے نہیں"---

رسول اللہ ﷺ کی وفات سے بڑھ کر اس امت کے لیے غم کی اور کیا منزل ہو سکتی ہے، لیکن دیکھیے اس موقع پر بھی مردِ مومن کا کردار کیا تھا۔ جناب علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سرکارِ دو عالم ﷺ کو غسل دے رہے ہیں اور ساتھ فرماتے جا رہے ہیں:

''اے آقا و مولا! یہ صدمہ جان کاہ تو ایسا ہے کہ اگر آپ نے صبر کا حکم نہ دیا ہوتا اور جزع فزع سے روکا نہ ہوتا، تو ہم آنکھوں کا پانی ختم کر دیتے اور ہمیشہ رنج و غم کی محفلیں لگائے رہتے''---

نہج البلاغہ میں ہے:

قَالَــهُ وَ هُوَ يَلِيْ غُسْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَ تَجْهِيْزَهٗ بِاَبِيْ وَ اُمِّيْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْكَ وَ سَلَّمَ) لَقَدِ انْقَطَعَ بِمَوْتِكَ مَا لَمْ يَنْقَطِعْ بِمَوْتِ غَيْرِكَ مِنَ النُّبُوَّةِ وَ الْاَنْبَاءِ وَ اَخْبَارِ السَّمَاءِ.......... وَ لَوْ لَا أَنَّكَ اَمَرْتَ بِالصَّبْرِ وَ نَهَيْتَ عَنِ الْجَزْعِ لَاَنْفَدْنَا عَلَيْكَ مَاءَ الشُّئُوْنِ وَ لَكَانَ الدَّاءُ مِمَا طَلًا---

[نہج البلاغہ، صفحہ ۲۲۷]

''جب حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ، حضور ﷺ کے غسل اور تجہیز و تکفین میں مصروف تھے، تو اس وقت آپ نے کہا:

''اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیک وسلم) آپ پر میرے ماں باپ قربان ہوں، آپ کی وفات سے وہ چیزیں منقطع ہو گئی ہیں، جو کسی اور کی موت سے منقطع نہیں ہوئی تھیں۔ یعنی نبوت، عالم غیب کی خبریں اور آسمان کی باتیں اور اگر آپ نے صبر کا حکم نہ دیا ہوتا اور جزع فزع سے نہ روکا ہوتا، تو آپ پر ہم آنکھوں کا پانی ختم کرتے اور یہ درد و غم نہایت طویل ہو جاتا''---

معلوم ہوا کہ فرزندانِ اسلام نے اپنے محبوب آقا ﷺ کے وصال پر بھی صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا تھا اور ثابت کر دیا تھا کہ مسلمان دنیا کی جاہل قوموں کی طرح جذبات کے جوش سے مغلوب نہیں ہو جاتا، بلکہ وہ زندگی کی راہوں میں جگر پاش صدمات کے موقع پر بھی اپنے بلند ترین اصولوں پر قائم رہتا ہے---

خود شہزادۂ خاندانِ رسالت سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ میدانِ کربلا کے خیمے میں اپنے گھرانے کی پاک خواتین کو جو وصیت فرما رہے تھے، وہ شہید اور اس کے پس ماندگان کے لیے اسلامی طرزِ عمل کی وضاحت کر دیتی ہے۔ محرم کی دسویں رات کو تلوار صاف کرتے ہوئے، آپ نے چند عربی اشعار پڑھے، جس پر حضرت سیدہ زینب رضی اللہ عنہا پُر آب ہو گئیں---

حضرت امام رضی اللہ عنہ نے اسی وقت اپنی غم گسار بہن کو خطاب کرتے ہوئے تسلیم و رضا کی لاثانی وصیت ارشاد فرمائی، کہ مبادا جوشِ غم میں ان سے کوئی بات صبر کے منافی ہو جائے۔ فرمایا:

اِتَّقِی اللّٰهَ وَ تَعَزِّیْ بِعَزَاءِ اللّٰهِ وَ اعْلَمِیْ اَنَّ اَهْلَ الْاَرْضِ یَمُوْتُوْنَ وَ اَهْلَ السَّمَاءِ لَا یَبْقُوْنَ وَ اَنَّ کُلَّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَ اللّٰهِ، اَبِیْ خَیْرٌ مِّنِّیْ وَ اُمِّیْ خَیْرٌ مِّنِّیْ وَ اَخِیْ خَیْرٌ مِّنِّیْ وَ لِیْ وَ لَهُمْ وَ لِکُلِّ مُسْلِمٍ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ .... یَا اُخَیَّةُ ! اِنِّیْ اُقْسِمُ عَلَیْكِ لَا تَشُقِّیْ عَلَیَّ جَیْبًا وَ لَا تَخْمِشِیْ عَلَیَّ وَجْهًا وَ لَا تَدْعِیْ عَلَیَّ بِالْوَیْلِ وَ الثُّبُوْرِ اِنْ اَنَا هَلَکْتُ---[کامل ابن اثیر، جلد ۴، صفحہ ۳۰]

"بہن! تقویٰ الٰہی پیشِ نظر رکھو، اللہ ہی کے نام سے تسکین حاصل کرو اور جان لو کہ نہ زمین والے باقی رہیں گے، نہ آسمان والے اور ذاتِ خداوندی کے سوا ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔ میرے باپ مجھ سے بہتر تھے، میری ماں مجھ سے

بہتر تھیں اور میرے بھائی مجھ سے بہتر تھے۔ میرے لیے، ان کے لیے اور تمام مسلمانوں کے لیے رسول اللہ ﷺ کی ذات ہی نمونہ ہے---

اے میری پیاری بہن! میں تمہیں قسم دیتا ہوں، مجھ پر گریبان نہ پھاڑنا، چہرہ نہ نوچنا اور اگر میں شہید ہو جاؤں تو مجھ پر نوحہ اور بین نہ کرنا"---

یہی وصیت [۱] جلاء العیون (مصنفہ ملا باقر مجلسی) میں ان الفاظ کے ساتھ درج ہے:

زینہار! کہ دست از شکیبائی بر مدارید و کلام ناخوشے بر زبان میارید کہ موجب نقص ثواب شما گردد---[جلاء العیون، صفحہ ۴۰۸]

"یاد رکھنا کہ دامن صبر نہ چھوڑنا اور کوئی نامناسب کلمہ زبان پر نہ لانا، جو تمہارے ثواب کی کمی کا باعث بن جائے"---

ان تمام اقتباسات کو سامنے لانے کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان اس حقیقت سے واقف ہو سکیں کہ ہمیں کیسے اعلیٰ، پاکیزہ اور مثالی کردار کی تعلیم دی گئی ہے۔ لیکن آج ہم کن خود ساختہ رسموں میں مبتلا ہو کر رہ گئے ہیں؟---

یہاں یہ سوال پیدا ہوگا کہ قرآن حکیم، رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات اور ائمہ اطہار کے

---

[۱]......جلاء العیون میں وہ وصیت بھی نقل کی گئی ہے جو رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیٹی سیدہ زہراء جنت رضی اللہ عنہا کو کی تھی:

ابن بابویہ بسند معتبر از حضرت امام محمد باقر رضی اللہ عنہ روایت کردہ است کہ رسول خدا ﷺ در ہنگام وفات بحضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا گفت، اے فاطمہ! چوں بمیرم روئے خود برائے من مخراش و گیسو پریشاں مکن، و واویلا مگو و نوحہ گراں را مطلب---[جلاء العیون، صفحہ ۶۵]

"ابن بابویہ نے حضرت امام باقر رضی اللہ عنہ سے سند معتبر کے ساتھ روایت کی ہے کہ حضور ﷺ نے وصال کے وقت حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:

اے فاطمہ! جب میرا انتقال ہو جائے تو میرے لئے چہرہ نہ نوچنا، بال نہ بکھیرنا، آہ و فغاں نہ کرنا اور نوحہ گروں کو نہ بلانا"---

اس قدر واضح ارشادات موجود ہونے کے باوجود غلط قسم کی رسمیں کیوں کر اختیار کر لی گئیں؟---

اس کا جواب نکہت شاہ جہاں پوری کے خیال کے مطابق یہ ہے کہ یہ سارا سلسلہ سیاسی مقاصد کے ماتحت معرض وجود میں لایا گیا تھا، وہ لکھتے ہیں:

"بقول ابن کثیر، شامی بحوالہ پروفیسر براؤن صفحہ ۳۱، یہ رسم محرم ۳۵۲ھ سے ۹۶۳ھ تک بغداد میں مروج رہی، اس سے پہلے دنیائے اسلام ان رسومات سے ناواقف تھی۔ سب سے پہلے معز الدولہ احمد بن بویہ نے محرم کی دسویں تاریخ کے لیے یہ حکم دیا کہ اس تاریخ کو تمام افراد سیاہ لباس پہنیں اور بازاروں کو بند کر کے سید الشہداء حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی تعزیت میں مشغول رہیں۔ چوں کہ پہلے سے بغداد میں یہ قاعدہ مروّج نہ تھا، اس لیے اہل سنت نے اس کو بدعت خیال کیا مگر چوں کہ معز الدولہ کے خلاف کچھ نہ کر سکتے تھے، اس لیے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ اس کے بعد خاندان دیالمہ کی شیعی حکومت نے محرم کے دس دن تمام شہروں میں اسی تعزیت کے لیے مقرر کر دیے۔ چناں چہ یہ رسم طغرل سلجوقی کی ابتدائی حکومت تک قائم رہی اور اس کے اثرات اب تک باقی ہیں---

اولاً یہ رسوم اور روضہ خوانی، نوحے اور بین زیادہ تر سیاسی مفاد پر مشتمل رہے ہیں، پھر رفتہ رفتہ مطلع سیاست صاف ہو جانے پر کہیں تو حقیقی سوز و گداز اور کہیں صرف رسم پرستی رہ گئی۔ مختار کی شورش یا سیاسی تحریک اور عباسیوں کی سلطنت کا سنگ بنیاد بھی انتقام حسین ہی کے نام سے قائم کیا گیا تھا، بلکہ یوں سمجھیے کہ ان دونوں تحریکوں کی فتح مندی اسی میدان کربلا کی مرہون ہے۔ لیکن افسوس ناک امر یہ ہے کہ ان سیاسی یا مذہبی شورشوں کے بانی اصحاب نے حق پرستی پر کبھی عمل نہیں کیا، بلکہ مذہب کے پردہ میں سیاسی مفاد ہی

اکثر مدنظر رہا---

اس کش مکش کا انجام یہ ہوا کہ دنیائے اسلام میں دو طبقے پیدا ہو گئے، جو اپنے اپنے دعوؤں کے ساتھ ہمیشہ برسرِ پیکار رہے۔ مسلمانوں کی بدبختی سے اب بھی یہ دونوں برسرِ پرخاش رہتے ہیں، ظاہر ہے کہ اب نہ وہ مسئلہ خلافت و میراث اور نہ وہ عباسی و اموی سلطنت، یا یوں سمجھیے کہ بے ملکی نواب کی طرح اسلام کے شیرازہ کو خود درہم برہم کر رہے ہیں، کاش--- ع

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

[از حسین بن علی، صفحہ ۱۱-۱۲]

میرا مدعا طنز و تعریض نہیں، بلکہ اس بات پر افسوس ہوتا ہے کہ محرم کی آمد پر ہمارے ہاں کشیدگی بڑھتی ہے اور اس میں خودساختہ رسموں کو دخل ہے۔ جب ماتمی جلوس والے سنی آبادی کے علاقوں میں سے گزرتے ہیں تو ان کے جوش میں اضافہ ہو جاتا ہے، جس کے نتیجے میں فریقین میں کشیدگی ابھرتی ہے اور کئی مقامات پر ناخوش گوار واقعات بھی پیش آتے ہیں۔ حالاں کہ یہ رسمی سلسلہ کوئی ضروری چیز نہیں، بلکہ اسلامی ہدایات کے منافی ہے۔ لہٰذا اگر اس کی بجائے محرم میں بڑے بڑے اجتماع اور عظیم کانفرنسیں منعقد کی جائیں تو یہ ملک و ملت کی سلامتی اور وحدت کے لیے بہت مفید ثابت ہوں---
ان اجتماعات میں ملک کے سلجھے ہوئے فضلاء مدعو کیے جائیں، جو آج کے راہ گم کردہ کاروانِ امت کو شہنشاہ اقلیم شہادت سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کا پیغام حق و صداقت سنائیں، ان کی عدیم المثال قربانی کے حقیقی مقاصد پر روشنی ڈالیں اور ان کی سیرت عالیہ کے ابدی خطوط مسلمانوں کے سامنے رکھ کر اس بھولی ہوئی قوم کو وحدت ملّی کے فلسفے سے آگاہ کریں:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر

سانحۂ کربلا، اقبال کی نظر میں

اسلامی تعلیم اور اسلامی تاریخ دونوں کی صحیح تفہیم، سیاسی بصیرت کے بغیر ناممکن ہے، کیوں کہ اسلام بہر حال انسان کے اجتماعی اور سیاسی امور کو خارج از دین قرار نہیں دیتا۔ چناں چہ اسلامی تعلیمات کے ہر جزو میں انفرادی اور اجتماعی پہلو ساتھ ساتھ سمو گئے ہیں۔ اس طرح کا امتزاج اسلامی تاریخ میں بھی پایا جاتا ہے۔ آپ اسلامی تاریخ کو محض چند شخصیتوں کے عروج و زوال کی داستان قرار دے کر اس کی گرہیں ہرگز نہیں کھول سکتے، بلکہ حق و باطل کی آویزش اور اسلام اور جاہلیت کی کش مکش کا پس منظر ذہن میں رکھتے ہوئے ہی

ابرِ رحمت بن کر اٹھے:

خاست آں سر جلوۂ خیر الامم
چوں سحاب قبلہ باراں در قدم

"اس موقع پر وہ شخصیت جس میں خیرامت کی خودداری مرتکز ہوگئی تھی، قبلہ کی سمت سے آنے والی بارش سے بھرپور گھٹا بن کر اٹھی"---

بادل اور بارش کی طبیعت تو یقیناً فیض رساں ہوتی ہے، لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جس زمین پر بارش برسے، وہ اپنی شوریدگی کی بنا پر بارانِ کرم کے اثرات قبول کرنے سے محروم رہ جاتی ہے۔ غالباً سرزمین عراق کی اس محرومی کی طرف اقبال اشارہ کرنا چاہتے تھے:

بر زمین کربلا بارید و رفت
لالہ در ویرانہ ہا کارید و رفت

"یہ بارش کربلا کی زمین پر برسی اور چلی گئی، یہ بارش ویران اور بنجر خطوں میں لالہ کاری کر کے روانہ ہوگئی"---

تاہم خونِ شہید، قوموں کی تاریخ میں کبھی رائیگاں نہیں گیا، اس موجۂ حق نے آمریت کے چہرے پر وہ زناٹے دار تھپڑ رسید کیا کہ وہ طویل اور طاقتور ہونے کے باوجود اپنے چہرے پر طرح طرح کے نقاب ڈالتی رہی اور قاہر و غالب ہونے کے باوصف مسلمانوں کے دلوں میں اپنا کوئی مقام نہ بنا سکی۔ نیز ملوکیت کے دیو استبداد کے رقص مجنونانہ سے سانحۂ کربلا کے رونما ہونے اور سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ جیسے مقدس و عزیز انسان کے شہید ہو جانے سے اسلامی تاریخ میں یہ حقیقت ثبت ہوگئی کہ فردِ واحد کے ہاتھوں میں ریاست کا سب اقتدار مرکوز ہو جانا، دنیائے سیاست کا بدترین جرم ہے۔

یوں شہادت امام حسین رضی اللہ عنہ، دنیا کی ساری تاریخ میں آمریت کے خلاف ایک منفرد احتجاج کی حیثیت رکھتی ہے، جس نے آمریت کے حق میں سیاسی، شرعی اور اخلاقی، کسی طرح کا کوئی جواز باقی نہیں رہنے دیا:

تا قیامت قطع استبداد کرد
موجِ خونِ او چمن ایجاد کرد

"سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے قیامت تک کے لیے استبداد (کے جواز) کی جڑیں کاٹ کر رکھ دیں اور اپنے خون کی موجوں سے خودداری و حق پرستی کا ایک چمنستان پیدا کر دیا"---

آپ نے اپنے دور کی عظیم عسکری قوت کے دباؤ اور دھمکی کے باوجود اعلائے کلمۂ حق کا فریضہ ادا کیا۔ اس سے آپ نے یہ سمجھایا کہ اسلامی ریاست میں فوجی طاقت اس لیے مضبوط بنائی جاتی ہے کہ اس سے دین کو تقویت اور سربلندی حاصل ہو، اس لیے نہیں کہ برسر اقتدار خاندان یا فرد اسے اپنی پوزیشن مستحکم کرنے پر صرف کرے۔ جب کوئی حکمران تلوار کو آئین ریاست کے تحفظ کے بجائے اپنے ذاتی جاہ و اقتدار کی تعمیر و حفاظت کا ذریعہ بنا لیتا ہے تو وہ سیرت فاروقی سے ہٹ کر فرعونیت کی راہ پر چل نکلتا ہے، جب کہ مردِ مومن، دین اور آئین کی تیغ عادل کا احترام کرنا تو جانتا ہے لیکن وہ فرعون کی تلوار کے سامنے سر جھکانے کے لیے کبھی تیار نہیں ہو سکتا۔ مرد حق کے کردار عظیم کی تفسیر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے پاکیزہ خون سے لکھی:

تیغ بہر عزتِ دین است و بس
مقصد او حفظ آئین است و بس

ما سوی اللہ را مسلماں بندہ نیست
پیش فرعونے سرش افگندہ نیست
خون او تفسیر ایں اسرار کرد
ملتِ خوابیدہ را بیدار کرد

''اسلامی ریاست کے سربراہ کے ہاتھ میں تلوار اس لیے دی گئی کہ وہ دین کی سربلندی اور آئین خداوندی کی حفاظت کرے، بندۂ مومن، غیر خدا کا کبھی پجاری نہیں بن سکتا اور اس کا سر کسی فرعون کے سامنے سجدہ ریز نہیں ہوتا، حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت نے ان اسرار کی تشریح کرتے ہوئے سوئی ہوئی قوم کو بیداری کا پیغام دیا''۔۔۔

جب وقت کے فرعون ''انا ربکم الاعلیٰ'' کا نعرہ بلند کرتے ہیں تو مردانِ حق لا الٰہ کی شمشیر جوہر دار لے کر ان کا ''لا غیری'' کا زعم باطل توڑ دیا کرتے ہیں:

تیغ ''لا'' چوں از میاں بیروں کشید
از رگِ اربابِ باطل خوں کشید

''جب آپ نے لا الٰہ کی تیغ براں نیام سے باہر نکالی تو اہل باطل کی رگوں میں خون خشک ہو گیا''۔۔۔

اگرچہ امویوں نے شام میں، عباسیوں نے بغداد میں اور دورِ ثانی کے امویوں نے غرناطہ میں مستحکم اور وسیع حکومتیں قائم کیں، جن کے بعض ایام میں اسلامی تہذیب فروغ پذیر ہوئی اور علوم و حکم اسلامی اوجِ کمال پر پہنچے۔ لیکن ان حکمرانوں کے ضمیر سے ملوکیت اور موروثی سلطنت کے جراثیم نہ نکلے۔ اس لیے اقبال کہتے ہیں کہ ملت کے

خودداری شعور نے اپنی تاریخ کے اس آمرانہ دور کے جاہ وجلال کو فراموش سا کر دیا:

شوکت شام و فر بغداد رفت
سطوتِ غرناطہ از ہم یاد رفت

''مملکت دمشق کی شان وشوکت اور بغداد کی پرشکوہ رونق سب جاتی رہی، نیز غرناطہ کی عظمت کے افسانے بھی بھلا ڈالے گئے''---

اس کے برعکس جو کارنامہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے انجام دیا وہ اگرچہ ایک لمحہ کا عمل تھا، لیکن چوں کہ وہ روح اسلامی کے عین مطابق تھا، اس لیے ملوکیت کی ہزار سالہ تاریخ کے مقابلہ میں وہ اہل ایمان کے نزدیک زیادہ وقیع وعزیز ہے اور اس کی یاد سرمایۂ ایمان ویقین ہے:

تار ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز
تازہ از تکبیر او ایماں ہنوز

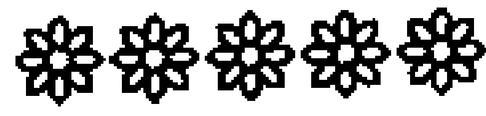
''ہمارے شعور ملی کے تار، مضرابِ حسینی کی ضربات سے ابھی تک تموّج پذیر ہیں اور ہمارے ایمان کی تازگی ان تکبیروں کی گونج سے ہے''---

آخر میں دیدۂ بینائے قوم نے اس امت مرحوم کے دور افتادگان کی طرف سے حضرت سیدنا امام عالی مقام رضی اللہ عنہ کی تربت پاک پر سلام بھیجا ہے:

اے صبا اے پیک دور افتادگاں
اشک ما بر خاک پاک او رساں

''اے صبا! دور افتادگان غربت کے لیے تو ہی قاصد ہے، ہمارے آنسو اس مقدس انسان کی لوحِ خاک تک پہنچا دے''---

امت کی اس دور افتادگی میں اقبال کا اشارہ اس خلیج کی طرف ہے جو صدیوں کی قیصر نوازی اور شاہ پرستی کے باعث اس امت اور حضرت امام رضی اللہ عنہ کے درمیان حائل ہو چکی ہے۔ دجلہ و فرات کی وادی آج بھی اس ابر کرم کی محتاج ہے۔



جانشینِ حضرت فقیہ اعظم

صاحبزادہ مفتی محمد محب اللہ نوری زیدمجدہ

کی ایمان افروز نگارشات

تصانیف

- رحمۃ للعالمین ﷺ کا پیغام امن
- گستاخِ رسول کا شرعی حکم
- ظہورِ نورِ مصطفیٰ ﷺ
- میلادالنبی ﷺ۔ صاحب میلاد کی کرم نوازیاں
- جس سہانی گھڑی چمکا طیبہ کا چاند
- رفعتِ شانِ رفعنا لک ذکرک
- افضلیت مدینہ منورہ
- ارمغانِ محبت (نعتیہ کلام)
- اسلام اور تصوف
- مخزنِ صدق وصفا۔۔ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ
- باب مدینۃ العلم۔۔ مرتضیٰ مشکل کشا، مولیٰ علی کرم اللہ وجہہ الکریم
- حبِّ اہل بیت
- بلال باکمال رضی اللہ عنہ
- حضرت فقیہ اعظم کے استاذ مکرم مفتی اعظم سیدی ابوالبرکات اپنے مکاتیب کے آئینے میں
- (غوث الوریٰ بحیثیت مظہر مصطفیٰ)
- سلطان الہند خواجہ خواجگان معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ
- شہنشاہِ ولایت حضرت گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ
- بہشتی دروازہ
- امام بخاری رحمۃ اللہ الباری
- حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ
- استاذ ابوالقاسم القشیری رحمۃ اللہ علیہ
- امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ
- امام عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ
- صاحب دلائل الخیرات رحمۃ اللہ علیہ
- حضرت باباجی ابوالنور محمد صدیق رحمۃ اللہ علیہ
- فقیہ اعظم۔۔ پیکر شفقت
- وقت کی قدر کیجئے

ترتیب وتدوین

فتاویٰ نوریہ (جلد اول، دوم ترتیب نو۔۔ جلد سوم تا ششم تدوین وتبویب)

- خطباتِ نوریہ

تراجم

ISBN 969-9079-22-3



قیمت =/150 روپے

فقیہ اعظم پبلی کیشنز بصیر پور (اوکاڑا)